کنیز نبوی
صنم سے صمد تک
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

صنم سے سمندر تک

کنیز نبوی

سمندر کی بے کراں وسعتیں تا حد نگاہ پر محیط تھیں۔ ٹھاٹھیں مارتے بحر بے کنار کے کنارے منتظر حسنین کی نگاہ اس ایک منظر پر اٹک کر رہ گئی۔

وہ لڑکی جو عشق کا جوش رکھنے والا لڑکا سمندر کی طرف بڑھتا۔ لہر قریب آتی تو بھاگنے سے اجتناب برتتا۔ کبھی وہ جیت جاتا تو کبھی لہریں' ارتکاب و اجتناب کے انوکھے کھیل میں کیسا سرور تھا۔

اس مسرور سے لڑکے کو دیکھتے ماضی کا کوئی سماں اس کی آنکھ میں اتر آیا تھا۔

جب سمندر ایسی گہری آنکھوں والی کی پلکوں کی جھالر پر اس کی انگشت شہادت انگلی کا پور آٹکا۔ محبت اجتناب و ارتکاب کے بیچ کیسی سہمی سہمی خوف زدہ رہتی ہے۔ امید و بیم کی یہ کیفیت گھائل کرنے کے لیے کافی ہے۔ اجتناب وارتکاب ہجر و وصال کے کنارے ہیں۔

ان میں سے ایک مکمل اختیار کرنا کم از کم آدمی کو اس کنارے کے سپرد تو کر دیتا ہے اور محبت کیف و مستی کے عالم میں کسی اونچ نیچ کے بغیر اپنی ڈگر پر سرنہوڑائے چلتی جاتی ہے۔

منتظر حسنین کی انگلی کا پور بھیگ گیا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اس کو شانوں سے پکڑ کر تھام لیا۔ اس وقت وہ خود اپنے احساسات کے شعور سے قاصر تھا۔ وہ محبت تھی یا ہمدردی۔

اک سسکی اس کے شانے کے پار اتر کر مٹی میں مل گئی۔

''منتظر حسنین! میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں' میرے دل کی شادابی اگر تمہارے وصل سے بہرہ مند ہے تو دل کی ویرانی تمہارے ہجر سے متصل۔''

آنسوؤں میں بھیگی آواز کی لڑکھڑاہٹ نے پانچ فٹ نو انچ کے منتظر حسنین کو لڑکھڑا دیا تھا۔

اس نے مضطربانہ نگاہ ارد گرد دوڑائی جیسے اس کو تلاشتا ہو۔ رات شام کے شانے پھلانگ کر اتر آئی۔ سمندر اس کی تنہائی بانٹنے اس کے پاؤں میں آپڑا۔

ریت پاؤں کے نیچے وقت کی طرح سرکتی جاتی تھی' سمندر ایسی محبت رکھنے والی لڑکی کی یاد کی امربیلیں

اس کے روئیں روئیں سے نکل کر جسم و جاں سے لپٹی جا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"سفر تاریخ کا ہو' زندگی کا۔۔ یا محبت کا۔ یا ایک زمین سے دوسری زمین تک کا۔ ہمیشہ روح اور جسم کو مضطرب و مضمحل دکھی اور تھکا دینے والا ہوتا ہے۔" وہ اس کے سفری بیگ میں چیزیں سمیٹتے بولی۔

وہ تولیے سے منہ پونچھتے مسکرایا۔ "لگتا ہے تم ان سارے سفروں کا ادراک رکھتی ہو۔ ہم تو جہاں ہیں وہیں مگن ہیں۔"

"ہوں!" اس نے گہری سانس بھری۔ "شاید ہمارے جیسے لوگ ہمیشہ ہی اسیر ادراک رہتے ہیں۔" متبسم ہو کر منتظر حسنین پر نظر مرکوز کی۔ وہ پرفیوم کا چھڑکاؤ کر کے اس کی طرف پلٹا۔ "نا سمجھ میں آنے والی باتیں اور چیزیں۔۔ ان سے میں ہمیشہ دور بھاگتا ہوں۔"

"ہاں۔ عقل۔ استدلال۔ شعور اور دل۔۔ انسان کے لیے ہمیشہ مشکل ترین' خطرناک اور بے رحم ثابت ہوتے ہیں۔" بیگ بند کر کے وہ صوفے پر ٹک گئی۔

"اور۔ تاریخ۔ زندگی۔ محبت۔۔ ان کے بارے میں تو میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ بس جو جہاں جب بھی اچھا لگے اس کو اپنا لو' حاصل کر لو۔" اس نے شانے اچکائے۔ "اور جو برا لگے اسے چھوڑ دو۔"

"کبھی بے خبری میں بھی عافیت ہوتی ہے۔" وہ سادگی سے مسکرائی۔ وہ بیگ اٹھا کر ٹی وی لاؤنج میں آیا۔

"اچھا آنٹی! چلتا ہوں۔ آٹھ دن بعد پھر آپ کا مہمان بنوں گا۔" وہ کہتے ان کے سامنے جھک گیا۔ انہوں نے شانوں سے پکڑ کر پیشانی کا بوسہ لیا۔

"مہمان کیوں بیٹا۔۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔"

وہ بیگ اٹھا کر گاڑی میں آبیٹھا۔

اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ایئرپورٹ تک سارا راستہ وہ خاموش رہی۔

"اتنے ماہ سے دیکھ رہا ہوں' بہت چپ چپ رہتی ہو۔ کوئی وجہ؟" اس نے مسکرا کر سر کو نفی میں جنبش دی۔

"وجہ کوئی نہیں۔ طبعاً" خاموش ہوں۔ ویسے آپ کو تو مکمل کمپنی دیتی ہوں۔ کوئی شکایت؟"

"ارے نہیں! مجھے تو تمہارے اور اپنے گھر میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ زیادہ اپنائیت بھرا ماحول ملتا ہے۔ جو کہ ہمارے گھر میں افراد کی کمی کی وجہ سے نایاب ہے۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی تم مجھے بہت کھوئی کھوئی اور اداس لگتی ہو۔ ایک جامد سکوت۔ سناٹے کی کیفیت۔" وہ سوٹ کیس کھینچتے ہوئے۔۔ رک کر بولا۔

وہ لمحہ بھر کے لیے سن سی رہ گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی بکھرتی دھڑکنوں پر قابو پالیا۔

"کیا یہ میرے جذبے سے واقف ہو چکا ہے۔" اس نے بغور اپنے ساتھ چلتے منتظر حسنین کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر بے فکری والا لاابالی پن دیکھ کر اس نے اپنی سوچ کی نفی کی۔

"میرے خیال سے میرا اکلوتا پن اس کا بڑا سبب ہے' اور شاید کچھ ہاتھ بے تحاشا مطالعے کا بھی ہے۔" وہ بھنویں سکیڑ کر لاپروائی سے بولی۔

"اچھا اب تم جاؤ۔ رات پھیلتی جا رہی ہے۔ آنٹی انتظار کر رہی ہوں گی۔" لاؤنج میں پہنچ کر وہ رکا۔ "ویسے کہنے کی ضرورت تو نہیں' پھر بھی اپنا خیال رکھنا۔"

"مشورے کا شکریہ۔" اس کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

وہ پلٹی۔ گاڑی کا لاک کھول کر بیٹھی اور ریورس گیر لگا کر بغیر اس کی طرف دیکھے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☼ ☼ ☼

بعض دفعہ اسے یہ سب کچھ خواب کی مانند محسوس ہوتا۔ ساری عمر اچھا کھانے پینے پہننے اوڑھنے کو ترستا ہی رہا تھا۔ مگر اچانک اتنی آسائشات سہولیات وہ قسمت پر حیران بھی تھا اور نازاں بھی۔

اس کی یادوں میں وہ دن پتھر کی طرح نقش تھے' جب یونیورسٹی کے ایڈمیشن کے لیے اس کی ماں نے اپنا حق مہر کا ہار بیچا تھا۔ اس نے دیکھا تھا وہ کتنی ہی دیر تک ہار کو لیے گم سی بیٹھی رہی تھیں۔ مگر تب اسے احساس نہیں تھا کہ وہ اس وقت ہار سے بندھی کتنی ہی خوشگوار یادوں کے حصار میں گھر چکی ہیں۔ اس وقت اعلا تعلیم کا جنون اس کے سر پر سوار تھا۔

اس کا ماموں رکشہ چلا کر گزر بسر کرتا تھا۔ ممانی جوانی میں ہی ٹی بی کے مرض کا شکار ہو گئی تھیں۔ اور اسی میں ان کی فوتگی ہوئی۔ اور پھر کچی آبادی میں بنے گھر میں وہ' اماں اور ماموں رہ گئے۔ بجلی' گیس' پانی کے بل دے کر وہ اتنا ہی بچا پاتے جس سے گھر کا راشن اور انٹر تک اس کے تعلیمی اخراجات ہی چلا سکے۔ روزانہ پچاس روپے جیب خرچ میں وہ کیسے گزارہ کرتا' یہ وہ ہی جانتا تھا۔

ماموں کی مالی حالت دیکھ کر وہ کلستا رہ جاتا۔ تب آنکھوں میں اعلا تعلیم کے بعد اچھی پوسٹ کے خواب اس کے اندر نئی توانائی بھر دیتے۔

"بس تعلیم مکمل کرنے کی دیر ہے۔ ماموں کو تو میں راج کراؤں گا۔" اچھے علاقے میں گھر اور زندگی کی آسائشات اس کی پہلی ترجیح بن چکی تھیں۔ جب بھی اپنے خواب ماں کو بتاتا' وہ خوش ہو کر اسے دعا تو دیتی مگر ساتھ میں یہ نصیحت بھی کرتی کہ "بیٹا! تمہارے حصے کا رزق تو تمہیں ہر حال میں ملے گا بس ذرائع حلال استعمال کرنا ہم نے تمہیں حلال لقمہ کھلا کر جوان کیا ہے۔" تب وہ فوراً" اپنی صابر شاکر ماں کے ہاتھ تھام کر چوم لیتا اور دل ہی دل میں رزق حلال کا عہد پختہ کر لیتا۔

"اماں! میں محنت کروں گا۔ دو ملازمتیں کروں گا مگر حلال لقمے میں حرام کی آمیزش نہیں کروں گا۔" تب ان کے ہاتھ دعا کے لیے بلند ہو جاتے۔

☼ ☼ ☼

"محبت انسان کو موم کی طرح پگھلا دیتی ہے۔ پانی کی

طرح بہا دیتی ہے۔ ہوا کی طرح اُڑا دیتی ہے۔ آگ کی طرح جلا دیتی ہے۔ مٹی کی طرح دبا دیتی ہے۔

میں حیا حسین... جس معاشرے سے تعلق رکھتی ہوں' وہاں لڑکیوں کا اندر ہی اندر سلگنا اور شب بھر آنچلوں کو بھگو دینا یہاں کے رواج ہیں۔ اس سماج نے ابھی عورت کو اپنی زندگی کے فیصلوں میں مختار نہیں بنایا۔ یہاں عورت ابھی تک ذاتی ملکیت تصور کی جاتی ہے۔ وہ محبت تو کر سکتی ہے لیکن اس کے اظہار پر پابندی ہے۔ حالانکہ محبت تو انسان کو سب کچھ بھلا دیتی ہے۔ مان' مرتبہ' حسب نسب... محبت کی وجہ سے شاہی تخت ٹھکرائے گئے۔ بادشاہ بھکاری بن گئے اور حکمراں مفتوح ہو گئے۔"

ڈائری کے آگے اوراق خالی تھے۔ وہ جو بیٹی کی مزاج پُرسی کرنے آئے تھے۔ اس کے کمرے میں ہکا بکا کھڑے تھے۔

"کیا حیا کا بخار ٹینشن کا نتیجہ ہے۔ محبت کی تپش ہے۔ اور میں اسے بیماری پر محمول کرتا رہا۔"

وہ متفکر' پریشان فوراً" کمرے سے نکلے تھے۔

✡ ✡ ✡

چھ ماہ بعد وہ گاؤں آئے تھے۔ خوشی سے نہال ہوتی سبز ہریالی نظروں کو تراوٹ بخش رہی تھی۔ تانگے بان سے ہلکی پھلکی گفتگو کرتے ہوئے بارہا دل ہمکا۔ نیچے اتر کر اپنی زمینوں میں چہل قدمی کریں۔ وہ دونوں اطراف کی پکی فصلوں کو دیکھ کے خوش ہوتے رہے۔

کپاس کے پودوں میں پھوٹنے والی پھٹیاں۔ دھان کی ہری بھری فصلیں اور قد آور کماد کے بیچوں بیچ بننے والی ٹیڑھی میڑھی راہوں پر دوڑیں لگانے' چھلانگیں مارنے اور پانی کے واٹر میں نہانے' پاؤں لٹکا کر بیٹھنے کے کناروں پر بیری' جامن' آم کے پھیلے۔ درختوں کو دیکھ کر ان کے ذہن میں بے شمار باتیں' یادیں' شرارتیں تیرنے لگیں ان کے بچپن کی ہم جولی' شرارتوں کی ساتھی۔

"اب کیسی ہو گی؟" وہ سوچ کر مسکرائے۔

"حمیرا!" انہوں نے زیر لب نام لیا۔ دل چاہا کاش وہ کہیں سے اب بھی سامنے آجائے۔ وہ دونوں ٹیڑھی میڑھی پگ ڈنڈیوں پر بھاگتے دوڑتے عجیب خواہش تھی۔ کیا بچپن' گئی زندگی' گئی عزت بھی پھر لوٹتی ہے؟

یادوں کے موتی چنتے چنتے خاموشی کے کتنے ہی لمحے دبے پاؤں چپ چاپ کھسکتے چلے گئے۔ تانگے بان نے اپنے تئیں سوالوں کے جواب میں کسی ان دیکھے منظر میں گم صم انہیں دیکھ کر اپنی زبان تالو سے چپکا لی۔

شفق زدہ شام کے اوپر رات نے آنے سے پہلے سرمئی چادر سے دھرتی کو ڈھانپ لیا۔ تانگے کی ٹک ٹک آہستہ آہستہ مدھم ہوتی چلی گئی۔ مغرب کی اذانیں ہو چکی تھیں۔ جب انہوں نے گاؤں کی حدود میں قدم رکھا تھا۔ کچے کوٹھوں سے اٹھنے والا دھواں اس بات کی علامت تھا کہ حضرت انسان پیٹ بھرنے کے انتظامات میں مگن ہیں۔

حویلی کا لکڑی کا لوہے کی میخیں لگا بہت بڑا دروازہ سامنے تھا۔ سوٹ کیس تانگے سے اتارا ہی تھا کہ بخشل دوڑتا آیا اور آتے ہی ان کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے کر اپنے کاندھے پر رکھ لیا۔

"چھوٹے ملک جی! اندر حویلی میں ملکانی جی آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔"

انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر حویلی کے اندر قدم رکھا۔

✡ ✡ ✡

اب کی بار فیصل آباد سے واپسی پر وہ اک احساس اور احسان تلے دبا ہوا تھا۔ ماضی کی کسمپرسی پر غمزدہ بار بار کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا۔ اتنی آسائشات کی ملکیت کے باوجود ساری زندگی ترستا رہا۔

"مگر وہ اپنے باپ کے گھر میں پیدا ہوتا تو کیا اتنی مشقت بھری زندگی گزارتا؟"

کالج سے یونیورسٹی تک وہ شام کو ٹیوشن پڑھا کر اپنی تعلیم کے اخراجات پورا کرتا تھا اور کچھ ماں سلائیاں کر کے رقم جوڑتی۔

ماں سے بے تحاشا محبت کے باوجود ذہن میں در

آنے والی سوچ کو روک نہ پایا۔

"آخر ماں نے ایسا کیوں کیا۔ خود بھی ساری عمر مشقت کرتی رہی اور مجھ سے بھی کرواتی رہی۔ آخر ماں نے ایسا کیوں کیا۔ کیوں اس نے مجھے باپ کا پتا نہیں دیا۔ ہمیشہ باپ کے ذکر پر کنی کترا کر بات بدل دیتی۔"

وہ منظر اس کے تصور میں تاحال محفوظ رہا۔ جب انٹر میں پوزیشن لے کر وہ گھر آیا تھا۔ تب ماں کے خوش ہوتے دمکتے چہرے کو دیکھتے ہی اس کے دل میں باپ کا خیال آیا اور زندگی میں پہلی مرتبہ سراپا سوال بن کر ماں کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"اماں! آخر بتاتی کیوں نہیں ہو کہ میرا باپ کون ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ زندہ ہے کہ مر گیا؟"

تب ماں کی آنکھوں میں گزرا وقت نمی بن کر اتر آیا۔ اس کے لب تھرتھرائے' کچھ بولنا چاہا مگر آواز حلق میں ہی گھٹ گئی۔ اجلا رنگ خوف سے تاریک ہو گیا۔ ایک لمحے میں ماں کے چہرے سے رونق اور زندگی کو اُڑتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر یکبارگی مردنی چھا گئی۔ ماں کے پورے وجود کو یوں ٹوٹتے بکھرتے دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔

ماموں نے پانی کا گلاس ماں کو تھمایا۔ چارپائی پر بٹھایا اور اس کو لے کر باہر نکل آئے۔

"بیٹا! آئندہ اپنی ماں سے کبھی یہ سوال مت کرنا۔ ورنہ وہ جیتے جی مر جائے گی۔ اپنی ماں کی زندگی بھی تم ہو اور دولت بھی۔ تمہارا باپ اک امیر شخص تھا اور ہم غریب لوگ یہ شادی صرف چند دن کی پسند کی بنیاد تھی۔ اس کے بعد اس نے طلاق دے کر تمہاری ماں کو اپنی زندگی سے نکال دیا۔

طلاق کے ٹھیک چار ماہ بعد تمہاری ولادت ہوئی۔ میری کوئی اولاد نہ تھی میں نے بہن کی واپسی اور تمہاری ولادت کو دل سے قبول کیا۔ تم ہی بتاؤ کیا میں نے تمہاری تعلیم و تربیت یا پرورش میں کوئی کمی رہنے دی ہے کیا؟"

"نہیں نہیں ماموں! کیسی باتیں کرتے ہیں؟" وہ جی بھر کے شرمندہ ہوا۔ ماموں اس کے ایڈمیشن کی فیس کے لیے رکشہ بیچنے کا سوچنے لگے تھے۔ ماں نے ہی سمجھایا تھا کہ اس کے بغیر گزارہ کیسے ہو گا۔ تب ماموں نے ہنس کر کہا تھا۔ "یہ میری ذمہ داری ہے۔ مزدوری کروں گا' ٹھیلہ لگاؤں گا مگر تم لوگوں کو بھوکا بیٹھنے نہیں دوں گا۔"

✡ ✡ ✡

"یہ گہری سوچ کسی راز کا پتا دیتی ہے۔ آپ کی یادداشت میں کوئی احساس' کوئی یاد لمحہ موجود کی موجودگی سے زیادہ اہم ہے۔ جو حاضر کو منظر سے غائب کر دیتی ہے۔"

وہ پُریقین لہجے میں بولتی حیا کو دیکھ کر خوش دلی سے بھنویں اچکا کر مسکرایا اور اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے لیا۔

"حیا حسین! تمہاری باتیں مجھے ہمیشہ لاجواب کر دیتی ہیں۔ تم واقعی ذہین لڑکی ہو۔"

حیا حسین کا فوراً" دل چاہا کہہ دے۔

"یہ ادراک تو مجھے محبت نے دیا ہے۔ اس میں ذہانت کا کیا دخل ہے؟" پھر اپنے اس خیال کو جھٹک کر بولی۔

"یہ طنز ہے' تعریف' مذاق یا خوشامد؟"

وہ کھلکھلا کر ہنسا اور اس لمحے حیا کے دل کی دھڑکنوں نے یقین دلایا کہ اس کی زندگی کی ساری خوشیاں اس کی ہنسی سے پھوٹتی ہیں۔

"ان میں سے کچھ بھی نہیں۔ یہ حقیقت اور سچائی ہے۔" اس نے پہلی بار حیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انتہائی یقین سے کہا تھا اور اس کے لفظوں کی سچائی آنکھوں کے رستے دل کے نہاں خانوں میں اترنے لگی۔

✡ ✡ ✡

"اماں! حمیرا کیسی ہے؟" حسین رضا گرم پراٹھے کے اوپر رکھے مکھن کے پیڑے میں نوالہ ڈبو کر منہ میں رکھتے بولا۔

"اچھی ہے میری بچی۔ آج تو مجھے ان کے پنڈ لے چل۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

اس کے دل میں وہاں جانے، اسے دیکھنے بات کرنے کا اشتیاق کنڈ کر بیٹھ گیا۔

میٹھی میٹھی کسک دل کے کناروں سے آلپٹی۔ فوراً بخشل کو آواز دے کر تانگہ لانے کا کہا۔ راستہ اس کے خیالات میں کٹ گیا۔ ہوش اس وقت آیا جب اماں اسے پکار کر اترنے لگی۔

سب سے ملنے کے بعد اس کی متلاشی نظریں حمیرا کو ہی تلاشتی رہیں۔ پتا نہیں کس کھوہ میں جا چھپی تھی۔ تب ہی وہ آگئی۔ اس کے گیلے بال پشت پر پھیلے تھے۔ شاید نہا کر نکلی تھی۔ وہ آکر اماں کے گلے لگ گئی۔

پھر پلٹ کر بے نیازی سے اسے سلام کرنے کے بعد اماں سے اتنے دنوں بعد آنے کا شکوہ کرنے لگی۔

اماں اسے اپنی مصروفیت، حسین رضا کی زمینوں کی دیکھ بھال۔ اور پڑھائی کے بارے میں بتاتی رہی۔ اب کی بار اس نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ وہ موقع کی تلاش میں تھا۔ اماں جب نماز پڑھنے کے لیے وضو کرنے گئی تو موقع میسر آگیا۔

"کہاں تھیں اتنی دیر سے۔ اتنا انتظار کروایا۔" بچپن والی بے تکلفی لہجے میں عود کر آئی۔

"کس نے کہا تھا انتظار کرنے کو؟" لبوں پر شرارتی مسکراہٹ مچلی۔

"دل نے۔" اس نے دونوں بازو سینے پر باندھ کر اسے دیکھا۔

"اپنے دل کو نکیل ڈال کر رکھ۔" وہ ہنسی۔

"تمہیں نکیل ڈال دوں، عمر بھر کے لیے، خود سے باندھ لوں۔"

"چل۔ بڑا آیا باندھنے والا۔" اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

تب ہی اماں کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ پھر شرافت سے بیٹھ گیا۔ وہ اسے گھورتے مسکرا کر باہر نکل گئی۔

"پھپھو! جائے نماز بچھادی ہے۔"

"جیتی رہو بیٹی! جیتی رہو۔"

☼ ☼ ☼

"اماں! میری فیس۔" ماہم نے ڈرتے ڈرتے سے کہا۔ فٹ بال کے ٹکڑے جوڑتی اس کی ماں نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"کہاں سے لاؤں تمہارے لیے پیسے، یہاں تو پیٹ نہیں پلتا۔ ساری عمر محنت کی، فیکٹری کے دھکے کھائے۔ پھر بھی چار پیسے نہ جمع ہو سکے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

اس نے سر جھکا لیا۔ اس چھوٹے سے کوارٹر میں ساری زندگی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترستے گزری ہے۔ کیا تعلیم حاصل کرنے کی خواہش بھی پوری نہ ہو سکے گی۔

"اماں! آج آخری تاریخ ہے۔ یہ فیس دے دیں۔ بعد کی ٹیوشنز پڑھا کر پوری کرلوں گی۔" منت سے بولی۔

"اتنا اونچا کیوں اُڑ رہی ہے تو کس لیے؟ میں تو تیری شادی کی تیاری کر رہی ہوں۔ اک اک پیسہ جوڑ کے بس کوئی اچھا رشتہ آجائے، اس کے انتظار میں ہوں۔" وہ ناصحانہ انداز میں سمجھانے لگی۔

"اماں! شادی کی بات نہ کریں، مجھے ہر حال میں پڑھنا ہے۔ اچھی جاب کرنی ہے۔ آگے بڑھنا ہے۔" اس نے عزم سے کہا۔

"ارے کیوں چڑھ گئی ہے تجھے خواہ مخواہ کی ضد، دیکھ۔ نعیم تیرے مقدر میں ہی نہیں تھا۔ اب مقدر سے تو کوئی نہیں لڑ سکتا ناں!"

"وہ میرے مقدر میں ضرور ہوتا، اگر میں بھی اعلا تعلیم یافتہ اور کھاتے پیتے گھرانے سے ہوتی تو اسے بچپن کی منگنی توڑنے کی جرات نہیں ہو سکتی تھی۔ اب میں اسے کسی مقام تک پہنچ کر دکھاؤں گی۔" اس کے لہجے میں اک عجیب بے قراری در آئی۔

"تجھے اچھی طرح پتا ہے کہ تیرا باپ نشئی تھا۔ ابھی دنیا کے تختے پر آئی بھی نہیں تھی تو کہ وہ ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ مجھے یقین ہی نہیں آیا مگر پھر روتے روتے صبر آگیا۔ اور یقین بھی۔" وہ نم آنکھیں دوپٹے کے پلو سے پونچھتے بولی۔

"وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میری بہن نے سہارا دیا۔ سر چھپانے کو چھت ملی، پیٹ بھرنے کو مزدوری۔ ورنہ تو ہمارا اس بھی جانور رکھا جاتے۔ لاہور میں تو کوئی بھی ہمارا نہ تھا۔"

"اماں! یہ داستان میں بچپن سے سنتی آئی ہوں۔ میری فیس کا مسئلہ حل کریں۔" وہ خوشامدانہ انداز میں بولی۔

"دیکھ ماہم! جو ایک ایک پیسہ جوڑ کے تیرے جہیز کے لیے جمع کرتی ہوں۔ وہ تو اپنی تعلیم کے چکر میں اڑا دیتی ہے۔ کہاں سے کروں گی تیری شادی؟ بول۔"

"اماں! کیوں پریشان ہوتی ہو۔ نوکری کر کے سارے پیسے واپس لوٹا دوں گی۔"

"ہاں نوکریاں تو جیسے درختوں پر لگتی ہیں کہ تو راہ چلتے توڑ لائے گی۔ ارے یہاں تو اچھے اچھے گھرانوں کے پڑھ لکھ کے سڑکوں پر دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ بغیر رشوت سفارش کے یہاں نوکری نہیں ملتی۔"

"خورشید! اب دے بھی دے۔ کیوں دل توڑ رہی ہے بچی کا۔"

اس نے خوش ہو کر تخت پر سلائی کرتی خالہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ جو اپنے نام کی مانند ہمیشہ اس کے حق میں اچھی صلاح دے کر ماں کو ٹھنڈا کر دیتیں۔ اماں نے آدھا جوڑا ہوا فٹ بال گھٹنوں سے پرے کیا اور اٹھ کر صندوق سے پیسے نکالنے لگی۔

☼ ☼ ☼

محبت کے بھی عجب اطوار ہیں۔ اپنے منتشر خیالات کی انجمن سجاتے سجاتے آنکھوں میں خواب، دل میں درد، ذہن میں تصویر یار سجائے محبت کے کار ہنر میں متجسس و مصروف رہتے ہیں۔

میں حیا حسین۔ اسے دیکھ کے ہی اسیر ہو گئی۔ حالانکہ وہ اتنا خوبصورت نہیں کہ دیکھنے والے ٹھٹھک کر رہ جائیں۔ وہ حسن کی اس معراج پر بھی نہیں کہ اک بار دیکھنے کے بعد بار بار دیکھنے کو دل چاہے۔ میں اس احساس کو سمجھنے سے مکمل طور پر قاصر ہو چکی ہوں کہ پھر میں اسے دیکھ کر کیوں پھڑکی ہوئی۔ ایک ہی جگہ جم کر آگے نہ بڑھ سکی۔ میری نظر اس سے ہٹتی نہیں، وہ میری بینائی، عقل سے شناسائی، دل سے دانائی، یک لخط چرا کر لے گیا۔ مجھے اک ہی منظر نے مبہوت کر دیا۔

اور میں حیا حسین کسی مندر کی دیوداسی کی طرح اس کے چرنوں میں پڑی ہوں۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے آنکھیں موندے۔ منتظر، غزنوی کی طرح آیا اور مجھے مفتوح بنا کر میری ذات کا سومنات ڈھا دیا۔"

لکھتے لکھتے ہاتھوں پہ بھی محبت کی تھکن اتر آئی تھی۔ اس نے سر رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

وہ ہلکے سے دستک دے کر بیٹی کو گڈ نائٹ کہنے کمرے میں آئے تھے۔ اسے سوتا پا کر رائٹنگ ٹیبل پر پڑی ڈائری اٹھائی۔

"منتظر حسین۔"

☼ ☼ ☼

شمالی علاقوں کے پہاڑوں کی برف باری سے پھوٹنے والی اک سرد کہر میں لپٹی شام لاہور گورنمنٹ کالج کے اسپتال کے کمرا نمبر ایس کے باہر اتر آئی۔

چوکور کمرے میں چار بیڈ تھے۔

کونے میں پڑے بیڈ پر لیٹا ہوا حسین رضا کورس کی کتابوں سے منہ موڑے دیوان غالب میں محو تھا۔

دل سے تیری نگاہ جگر میں اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

غزل کا اک اک مصرعہ اس پر وارفتگی طاری کرتا رہا۔ حمیرا کا وجود اس کے سامنے مجسم ہو گیا۔

گو کہ اس کے پاس خط و قاصد و فون کی مانند بھرپور وسیلہ اظہار کا ذریعہ نہ تھا، مگر اس کے سامنے آتے ہی حمیرا کے لب مسکرا اٹھتے۔ چہرے کی تابناکی اور شگفتہ بیانی عروج پر ہوتی۔ اس کی اک اک ادا اس بات کی

گواہی دیتی کہ حسین رضا کی محبت میں گرفتار و سرشار ہے۔

اس موسم سرما میں وہ فوراً" گاؤں آنے کے ارجنٹ تار پہ سامان سفر باندھ کر ریل میں آسوار ہوا۔ عجب طرح کے وسوسوں کے ناگ اسے ڈس رہے تھے۔

ماں ٹی بی کی مریض تھی۔ پتا نہیں کیا ہوا جو یوں بلوایا گیا۔ ماں کے لیے دعا میں مانگتا اسٹیشن پر اترا تو خاندانی تانگہ بان کو نہ پا کر جی جان سے ہول اٹھا۔

"یقیناً" کوئی پریشانی کی بات ہے۔ ورنہ ایسا تو کبھی نہ ہوا کہ میں لاہور سے آؤں اور سواری پہلے سے اسٹیشن پر موجود نہ ہو۔"

وہ سوٹ کیس اٹھا کر تانگہ کرائے پر کر کے آبیٹھا۔ سارا راستہ سراٹھوں میں دبے وہ پریشان بیٹھا رہا۔ کوئی خیال کوئی منظر اس کی توجہ کھینچنے میں ناکام رہا۔

"سب خیر ہے ناں؟" سامنے سے دوڑتے ہوئے آنے والے ہخشل سے بے تاب ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں چھوٹے ملک جی! ملک حسنین رضا کی شادی ہے۔"

"بھائی کی۔" اسے خوشگوار حیرت نے گھیرا۔

"تمہارے ماموں کاروبار کے سلسلے میں کراچی جارہے تھے۔ میں نے پکڑ لیا۔ پہلے مجھے بیٹی بیاہ کردے دو' پھر چھوڑوں گی۔ بس آناً" فاناً" تیاری ہوئی۔ جلدی میں تمہیں تار بھیجا۔"

ماں مسلسل جوش سے بولتی جارہی تھی مگر اس کے پاؤں سے زمین کھسک گئی۔

اس کی مثال اس مسافر کی سی تھی' جو منزل پر پہنچ کر تہی دامن رہ گیا ہو۔

تقدیر کی لکھی ازلی تحریر اس کی زندگی کی لوح پر برق رفتاری سے رقم ہوگئی اور وہ اپنی ازلی سست رفتاری کے باعث حسن کی جلوہ گاہ سے ہجر کی خلوت گاہ میں ساکت و ساکن رہ گیا۔

محبت اپنی ساری حشر سامانیوں سمیت اس کے پیش قدم رہی۔ وہ سر اٹھائے اس کے ہم قدم رہا مگر جب سر اٹھایا تو ہجر کی طویل مسافت پر تنہا کھڑا تھا۔

حسین رضا نے شادی کی ساری رسومات میں علاوہ میں جلتے ہوئے غائب دماغی کی کیفیت میں حصہ لیا۔

مگر وہ تباہ کن ساعت جب منہ دکھائی کے لیے دیور کو پکڑ کر آگے کر دیا گیا۔

"بھرجائی کو سلامی دے پگلے!" اماں کی سرشار آواز ابھری۔

اس لمحے محبت کی تپش اور نارسائی کی آگ میں جلتے ہوئے حسین رضا کی لال بھبھوکا آنکھوں میں ساری تلخی' سارا کرب سمٹ آیا۔

اس وقت حسین رضا کے نام پر حسنین رضا کے پہلو میں بیٹھی دلہن نے بے خودی سے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔

بس یہی لمحہ قیامت خیز تھا۔ حسین رضا کے انگ انگ سے پھوٹ کر نکلنے والے بے وفائی کے طعنوں نے اسے جلا کر رکھ دیا۔

رات ہونے تک دلہن کی طبیعت خراب ہوئی۔ کسی نے نظر لگنے کی قیاس آرائی کی' تو کسی نے جن و پری کے سائے کی خبر اڑائی۔ کسی نے جادو ٹونے کو قصور وار ٹھہرایا۔ مگر حسنین رضا کے لیے صرف سہاگ رات ہی نہیں' ساری عمر کے لیے کم ابدری مقدر ہوئی۔

حمیرا کو آئے دن پڑنے والے بے ہوشی کے دورے طویل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ماں پوتے کی آس لیے قبر میں جا سوئی۔

حسین رضا نے شہر میں ہی تعلیم کی تکمیل کے بعد کاٹن فیکٹری میں منیجر کی جاب کرلی۔

☼ ☼ ☼

"سر! یہ فائل کمپلیٹ ہے۔ اس میں منصوبے پر لگنے والی رقم کا تخمینہ' نقشہ اور مکمل معلومات ہیں۔" وہ ان کے پیچھے آفس میں داخل ہوتے بولا۔

ایم ڈی صاحب نے کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر رکھا اور مشفقانہ نگاہ اس پر ڈالی۔

"بیٹھو بیٹا!" وہ کچھ دیر اپنے سامنے بیٹھے منتظر کو بغور

دیکھتے تذبذب کا شکار نظر آتے رہے۔ کبھی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنساتے۔ کبھی ہاتھ سیدھے کرکے فائل کے اوپر رکھتے۔

"منتظر بیٹا! مجھے تمہاری قابلیت' ذہانت اور ایمان داری دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔ درحقیقت تم بہت اچھے انسان ہو اپنے باپ کی طرح۔"

"سر! آپ جانتے ہیں میرے باپ کو؟" اس کے لہجے میں تجسس و حیرانی نمایاں تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ اولاد میں والدین کی تربیت و شرافت منتقل ہوتی ہے۔ تمہیں دیکھ کر ہی احساس ہوتا ہے کہ تم بہت اچھے نیک طبیعت والدین کی اولاد ہو۔ میری دلی خواہش ہے کہ میرے منہ بولے بیٹے سے حقیقی بیٹے بن جاؤ۔"

"جی سر!" وہ کرسی پر بیٹھے حیرت سے آگے سرک آیا' اس کا عکس ٹیبل کے شیشے میں واضح دکھنے لگا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میری صرف ایک ہی بیٹی ہے حیا۔ بے حد حساس' آرٹسٹک مزاج' کتابوں کی رسیا' زمانے کی اونچ نیچ سے بہت دور' اس کے لیے مجھے تم سے بہتر لڑکا نہیں ملے گا۔"

"سر! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"بیٹا! تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے معاشرے میں کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کا رشتہ خود نہیں دیتا۔ مجھے تم پر پورا مان اور بھروسا ہے۔ اس لیے خود بات کی ہے۔ بہرحال انکار اور اقرار کا حق تمہارے پاس محفوظ ہے۔ ہر صورت تم اس آفس میں کام کرتے رہو گے۔"

"سر! میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا۔" وہ عاجزی سے سر جھکا کے بولا۔

"تم ہی قابل ہو۔ یہ فیصلہ مجھ پر چھوڑ دو۔ تم سوچنے کے لیے وقت لے سکتے ہو۔"

"جی سر!" وہ سعادت مندی سے بولا۔

"میں اس نئے کنٹریکٹ سے فارغ ہو کر کراچی کا چکر لگاؤں گا۔ کنسٹرکشن کا جائزہ لوں گا۔ تم حیا کو سائٹ پر لے جانا تاکہ اگر کام اس کی مرضی کے خلاف ہو رہا ہو تو وہ تبدیلی کروالے۔"

"جی بہتر سر!" ٹیکسٹائل مل کی تیار ہونے والی شاندار عمارت ان کے تصور میں آسمائی' جو حیا اور اس کے متوقع شوہر کو گفٹ کرنی تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ' جو خواب آنکھوں میں سجائے' ریزہ ریزہ ہوگئے۔ کرچیاں تھیں' جو مسلسل چبھ رہی تھیں۔

"ماہم کی تو مجھے کوئی فکر نہیں جیسے ہی لڑکا ڈاکٹر بنے گا۔ فوراً" اس کا بیاہ کروں گی۔" ماں اٹھتے بیٹھتے تشکر سے کہتی۔

بچپن سے سنتے اس کو یہ الفاظ ازبر ہوگئے تھے۔

مگر جیسے ہی وہ ڈاکٹر بنا۔ اچھے گھرانے کی لڑکی بیاہ لایا۔ وہ اپنی غربت کسمپرسی کے ساتھ اس امید پر گزارہ کررہی تھی کہ شادی کے بعد اس کی خواہشات پوری ہوں گی۔ مگر اب ایک دم سے یہ دھکا۔ اوپر سے ٹھکرائے جانے کا احساس۔ انا پر سخت ضرب لگی۔

اس کے اندر اس صدمے کے بعد آگے بڑھنے اونچا معیار زندگی حاصل کرنے کی جستجو اور لگن بڑھ گئی۔ پڑھنا ہے۔ اور آگے بڑھنا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ سارے کام کا جائزہ لے کر بہت تھک چکی تھی۔ اپنے آفس میں دو تبدیلیاں کرانے کی ہدایات دے کر منتظر کے ساتھ گاڑی میں آبیٹھی۔

"کتنا ٹائم لگے گا؟"

"تقریباً" ایک ماہ اور۔" وہ گیٹ سے گاڑی نکالنے لگا۔

"گھر چلیں!" اس نے سوالیہ انداز میں حیا کو دیکھا۔

"شام ہوگئی ہے۔ ایک چکر سمندر کا نہ لگائیں؟"

"ضرور۔ ضرور۔" وہ بغور دیکھتے مسکرایا۔

پھر وہ مختلف کیسٹ پلیئر لگاتا رہا مگر اس کی توجہ رتی بھر اس کی طرف نہ ہوئی۔ خاموشی کے حصار میں گھری سوچوں میں ڈوبی نظر آئی۔ سارا راستہ وہ اسے دیکھتا

جانچتا آیا تھا۔

اس کے سراپے کا' نقوش کا جائزہ لیتا رہا۔ اپنے ساتھ بیٹھی حیا پر اک نظر ڈالتا پھر ونڈ اسکرین میں دیکھتا۔ یہ میرے ساتھ بیٹھ کر کیسی لگ رہی ہے۔ اس نے سوچا۔

اس کی رنگت گندمی' حیا کی سانولی مائل۔ ان دونوں کی ناک ستواں تھی۔

بڑی بڑی آنکھوں میں ایک گہرائی اور اپنے لیے محبت ہلکورے لیتی نظر آئی۔ گھنی پلکیں اس کے حسن میں اضافے کا باعث تھیں۔ جبکہ حیا کے مقابلے میں اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں۔ گھنی مونچھیں' بھرے بھرے ہونٹ۔

ساحل کی ریت پر اپنے ساتھ چلتے ہوئے بہت بھلی لگ رہی تھی۔

سمندر کی بھیگی تیز ہوا سے حیا کا دوپٹا اڑ کر اس کے گرد لپٹ گیا۔ اس نے اک قدم آگے آکر دوپٹے کا تھاما ہوا پلو اس کے سامنے کیا۔ وہ بے ساختہ ہنسی۔ دوپٹا اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

"لگتا ہے میوزک میں تمہاری دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اتنے اچھے گانے چلتے رہے مگر تمہاری توجہ ہی نہیں ہوئی۔"

یکبارگی اس کا دل چاہا کہہ دے تمہارے ہوتے ہوئے کسی چیز میں دلچسپی نہیں ہوتی۔ مگر صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

"اتنی گم کیوں رہتی ہو؟"

"کسی کی قربت کے احساس میں گم رہتی ہوں۔"

"کس کے؟" وہ عین اس کے سامنے راستہ روک کے کھڑا ہوا۔

"اس کے' جو ہر قدم پر میرا راستہ روکے کھڑا ہوتا ہے۔" وہ کہنے کو کہہ گئی۔ مگر اس کی بھرپور مسکراہٹ دیکھ کر جھینپ سی گئی۔

"بابا کا فیصلہ قبول ہے؟" اس نے نگاہ حیا کے چہرے پر مرکوز کر کے استفسار کیا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ اس کی مرتکز نگاہ سے گھبرا کر سمندر کی موجوں کو دیکھنے لگی۔

"یہ دلی رضامندی ہے یا سعادت مندی؟" اس نے خوش دلی سے ہنستے ہوئے بازو سینے پر باندھے۔

"دونوں ہی۔" ہوا کی طرح سرسراتی آواز اس کے وجود سے ٹکرا کر اسے ہواؤں میں اڑا لے گئی۔

دونوں سرور کی کیفیت کو دل میں جذب کر کے ہنسے۔

دور سمندر کی گود میں لیٹنے والے سورج نے اک آنکھ میچ کر محبت سے انہیں دیکھا اور مطمئن ہو کر سو گیا۔

☆ ☆ ☆

جب سے اس کی شادی ہوئی تھی گھر میں بیٹھنا دوبھر ہو گیا تھا' وہ تھکا ماندہ زمین سے آتا کہ گھر جا کر سکون کا سانس لے گا۔

گھر جو انسان کی پناہ گاہ' تسکین' آرام' خوشی و سرور کا مرکز ہوتا ہے۔ وہ گھر اس کے لیے صرف ایک قیام گاہ بن چکا تھا۔ وہ کمرے کی طرف آتا تھا دروازہ بند ملتا۔ ماں کا کمرا اس کی سرائے تھا۔ وہ مسافر اس میں رات تکتا' پھر علی الصبح اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے چلا جاتا۔ گھر میں اس کے کھانے پینے کا خیال ملازمہ رکھتی اور اوپر کے کام' کپڑے' جوتے' تیل' کنگھی' سرمہ' عطر وغیرہ بخشل کی ذمہ داری تھا۔

سوئے اتفاق حمیرا سے اس کا سامنا ہو بھی جاتا تو اس کے پاگل پن کے دورے اس کو گھڑی بھر ٹکنے نہ دیتے۔ وہ اپنے بال نوچتی' وہ ہتھے لگ جاتا تو اس کے بال نوچتی' چٹکیاں کاٹتی' اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑنا شروع کر دیتی۔ پورے گاؤں میں یہ بات زبان زد عام تھی کہ حسنین رضا کی بیوی حمیرا کے اوپر شادی کی پہلی رات ہی خطرناک سائے کا اثر ہو گیا۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں کھسر پھسر کرتیں۔ سہاگ رات جس دلہن پر زیادہ روپ آجائے اور اس پر کوئی جن عاشق ہو جائے تو اس کو اپنی بیوی بنا لیتا ہے۔ کبھی بھی شوہر کو دلہن کے قریب نہیں جانے دیتا' شوہر پاس جائے گا تو

بیوی کو دورہ پڑے گا۔

عورتیں جھرجھری لیتیں اور ایسی فرسودہ باتوں سے خوف زدہ ہو کر کانوں کو ہاتھ لگا کر فوراً" توبہ تائب ہوتیں۔

اس کے آئے دن کے دوروں سے تنگ آکر حسنین رضا زمینوں پر بنے ڈیرے پر رہنے لگا۔ وہاں منشی کی بیٹی زبیدہ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی مگر سلیقہ مند' خوبصورت اور نوجوان تھی۔

نوجوان تو وہ بھی تھا۔ بیوی کے پاگل پن سے پریشان ایک جائے پناہ زبیدہ کے وجود میں میسر آئی تو اسے گنوایا نہیں۔ منشی سے رشتہ مانگ کر سادگی سے نکاح پڑھوا لیا۔ زبیدہ اس کے دل کی رانی کے ساتھ گھر کی ملکہ بھی بن گئی۔

ڈیرے پر ہی اس نے خوبصورت گھر بنوا لیا۔ حویلی کا جو دوسرے تیسرے روز چکر لگاتا تھا اب ہفتوں بعد ملازمہ کو راشن پانی کا خرچا دے کر کھڑے کھڑے چلا جاتا حمیرا کو دیکھے بغیر۔

ان ہی دنوں حسنین رضا زمینوں میں اپنا حصہ وصول کرنے حویلی پہنچا تو صرف حمیرا' ملازمہ اور بخشل کو پایا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے یہ رشتہ قبول ہے سر! آپ جیسے فرشتہ صفت انسان سے رشتہ جڑنا میرے لیے باعث سعادت ہے اور حیا جیسی جینئس لڑکی کا لائف پارٹنر بننا بہت بڑی خوش نصیبی۔"

فیصل آباد پہنچتے ہی ایم ڈی صاحب کے بلاوے پر نہایت اعتماد اور پروقار طریقے سے اس نے اپنی رضامندی سے مطلع کیا۔

"برخوردار! مجھے تم سے اسی سعادت مندی کی توقع تھی۔" ڈائریکٹر صاحب بہت خوش تھے۔

انہوں نے اپنی کرسی چھوڑ دی' ٹیبل کی دوسری طرف سے گھوم کر اس کی طرف آئے۔ وہ تعظیماً" کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے گلے لگا کر پیشانی چومی۔ "آئی لو یو مائی سن۔"

اس کی آنکھوں میں بے ساختہ نمی تیر گئی۔ اس کا باپ ہوتا تو وہ بھی شاید اتنی ہی شاندار شخصیت کا مالک ہوتا۔ اس نے ایم ڈی کی آنکھوں کی چمک کو کئی گنا بڑھتے دیکھا۔

"سر! میرا اس دنیا میں ماموں کے علاوہ اور کوئی نہیں' باپ کو تو زندگی بھر نہیں دیکھا۔ ماں کی علیحدگی ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود جب سنا کہ بابا ان کو چھوڑنے کے بعد جلد ہی فوت ہو گئے تھے تو صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور بیمار ہو گئیں۔ کچھ عرصے کے بعد ان کی بھی ڈیتھ ہو گئی۔ میں چاہتا ہوں زندگی کے اتنے بڑے موڑ پر ماموں میری خوشیوں میں شامل ہوں۔"

"ضرور۔ ضرور برخوردار۔ کہاں رہتے ہیں تمہارے ماموں؟"

"سر! اسی شہر میں۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ چلو ابھی لے آتے ہیں۔"

"سر آپ؟" اس نے تعجب سے کہا۔

"ہاں۔ کیوں میں نہیں چل سکتا۔"

"کیوں نہیں سر؟" وہ دل سے مسکرایا۔ وہ ان کی لش پش کرتی بی ایم ڈبلیو میں آ بیٹھا۔ "کہاں چلیں؟"

ایم ڈی صاحب کے استفسار پر وہ قدرے کھسیانا سا ہو گیا۔ اسے افسوس ہوا۔ اس نے کوئی بہانہ کر کے انہیں آفس میں ہی کیوں روک دیا۔

"سر! آپ کو تو پتا ہے کہ میرا تعلق جھنگ روڈ پر فیصل آباد کی مضافات سے ہے۔"

جب گاڑی ان تنگ گلیوں میں پہنچی تب تک اس کی فطری خود اعتمادی لوٹ آئی تھی۔ اس کے پاس ذہانت و علم کی دولت تھی' جو خریدی نہیں جا سکتی۔ اس سوچ پر مطمئن ہوا۔ وہ گاڑی سے اتر کر تنگ گلیوں میں چلنے لگا' تیسری گلی میں اپنے گھر کے سامنے پڑے تالے کو دیکھ کر رک گیا۔

"سر! اس وقت یقیناً" ماموں کام پر گئے ہوں گے۔ اصل میں وہ رکشا چلاتے ہیں۔ میں نے شاید آپ سے ذکر کیا تھا۔"

"ارے منتظر بیٹا! کیسے ہو۔"

انہوں نے لال دھاری دار رومال شانوں پر پھیلائے سفید ٹوپی پہنے متناسب قدو قامت کے آدمی کو بغور دیکھا، جو منتظر سے گلے مل رہا تھا۔

"سر! یہ ہمارے پیش امام ہیں، میں نے قرآن شریف ان ہی سے پڑھا ہے۔"

"جی جی۔ یہ ان ہی گلیوں میں پل کر جوان ہوا ہے۔ بس جناب پوت کے پاؤں پالنے میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ میں تو شروع سے کہتا تھا کہ اپنی ذہانت اور علم سے یہ بہت ترقی کرے گا۔ بہت آگے جائے گا۔"

وہ جو انسانی کمزوری کی بنا پر اک لمحے کے لیے شرمندہ ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے تعریف نے پھر پُراعتماد بنا دیا۔

"جی۔ میں دل سے قدر کرتا ہوں، اس لیے اس کے محسن و مربی ماموں سے بذات خود ملنے آیا ہوں۔"

انہوں نے مصافحہ کرتے پیش امام کو مدعا بتایا۔

"جناب! ہم تو سمجھے کہ حمید کو منتظر میاں لے گئے ہیں۔ وہ تو کافی عرصے سے کسی کو نظر نہیں آیا۔ اس کا رکشا بھی نہیں۔ ہم سمجھے کہ بیچ دیا ہے۔" وہ حیرت و استعجاب سے منتظر کو دیکھنے لگے۔

"ماموں کہیں چلے گئے ہیں؟" اسے سخت دھچکا لگا۔

"کہاں جا سکتے ہیں۔" خود کلامی کی۔

"ان کا کوئی دوست رشتے دار؟" انہوں نے استفسار کیا۔

"نہیں سر! مجھے تو ایسا کوئی بھی قریبی عزیز یاد نہیں پڑتا، جن کے پاس وہ جائیں، وہ بھی اتنے عرصے کے لیے۔" وہ پریشانی سے بولا۔

گندی نالی سے ٹراتے ہوئے مینڈک باہر آنے لگے۔ بدبو کا اک بھبکا اٹھا۔ اس نے گھبرا کر ایم ڈی صاحب کو ناگواری سے ناک پر رومال رکھتے دیکھا۔

"چلیں سر! کہیں اور پتا کرتے ہیں۔"

☆ ☆ ☆

"سوچتی ہوں کہ محبت میں وصل کی تمنا کیا معنی رکھتی ہے کیونکہ وصال تو بہر صورت ہے۔ محبوب ہم سے دور ہی کب ہوتا ہے۔ تصور و خیالات میں ہمارے پاس، ہماری دسترس میں ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے دل اسے مجسم دیکھنے چھونے، باتیں کرنے کو ہمکتا ہے۔

اور محبت میں یہ تاثیر ہے کہ چھپائے نہیں چھپتی۔

اور میں حیا حسین۔۔۔ جس محبت کو اپنی ذات سے بھی پوشیدہ رکھنے میں مگن تھی۔ اس محبت کو میرے بابا جانی نے جان لیا اور میرے دامن طلب میں ڈال دیا۔

میں دنیا کی وہ خوش قسمت، خوش نصیب لڑکی ہوں، جس کے آگے نہ ریت و رسم رکاوٹ بنی، نہ ظالم سماج آڑے آیا۔ میری خوشی کی نہ انتہا، نہ مسرت کو ناپنے کا پیمانہ کہ میرے بابا جانی نے مجھے وارفتہ شوق گرفتار محبت پا کر میری آرزو پوری کر دی تھی۔

☆ ☆ ☆

پشیمانی، ندامت اور احساس جرم کا اک نہ رکنے والا سلسلہ تھا، جس میں وہ غرق ہو رہا تھا۔ آسائشات و آرام کا عادی ہو کر وہ اپنے ماموں کو بھول بیٹھا، جس نے پالا پوسا، پڑھایا لکھایا۔ اعلا عہدے پر پہنچ کر اپنے محسن و مربی سے بے خبر رہا۔

ڈھائی ماہ پہلے جب ان سے ملنے آیا تھا تو ان کو اپنے ساتھ چلنے کا کہا تھا۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں پرائے گھر میں جا کر نہیں رہوں گا۔ تم اپنے مالک کے گھر میں رہتے ہو، اپنا گھر لو گے، تب ہی چلوں گا۔

اسی دن واپسی میں ضروری فائلیں دینے آفس پہنچا تو سر نے اسے دامادی میں لینے کا عندیہ دیا۔

چاہنے کے باوجود وہ یہ خوش خبری ماموں کو نہیں سنا سکا۔ اس کی فلائٹ کا ٹائم ہو چکا تھا۔ کراچی میں نئی ٹیکسٹائل مل کے انفرا اسٹرکچر کے جھمیلوں میں پھنسا رہا۔ حیا کا مرکز نگاہ۔۔۔ اس کی پسندیدگی اب ڈھکی چھپی

بات نہ تھی۔

ماموں کی گمشدگی نے اسے بوکھلا دیا۔ اس نے ایم ڈی صاحب کی مدد سے پولیس اسٹیشنز‘ ہاسپٹلز‘ ایدھی سینٹر کا ریکارڈ چیک کروایا۔ ہر جگہ ڈھونڈا‘ مگر کوئی پتا نہیں چل سکا۔ ڈائریکٹر صاحب نے چاروں طرف اپنے آدمی پھیلا دیے ڈھونڈنے پر‘ مگر کہیں سے امید افزا خبر سننے کو نہ ملی۔

وہ مامی اور ماں کی طرح ماموں کو بھی رو‘ پیٹ کر بیٹھ گیا۔ مگر اک کسک ضرور تھی‘ جو ٹیس بن کر دل میں چبھتی رہی۔

ڈائریکٹر صاحب نے جس طرح ماموں کو ڈھونڈنے میں اس کے ساتھ تگ ودو کی تھی۔ اس بنا پر اس کے دل میں ان کی عزت کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ حیا کا مسلسل فون پر رابطہ اسے ڈھارس بندھاتا۔

بیس دنوں کے بعد ناکام ونامراد وہ کراچی لوٹ آیا۔

✡ ✡ ✡

حویلی کی اجڑی حالت اک نوکرانی کے رحم وکرم پر دیکھ کر اسے رنج پہنچا۔ وہ حمیرا کے کمرے میں آیا۔

”یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ تمہیں دورے پڑتے ہیں یا آسیب کا سایہ ہو گیا ہے؟“ وہ حیرت سے گویا ہوا۔

”تم سے بڑا آسیب میری زندگی میں نہیں آسکتا حسین رضا! بزدل تھے‘ نامرد تھے‘ تب ہی پریت کی ڈور کو توڑ کر چھپ کر بیٹھ گئے۔ نہ آنا پتا چھوڑا‘ نہ کبھی لوٹ کر خبر لی۔“ وہ ملگجے سے حلیے‘ بکھرے بالوں‘ وحشت زدہ لال بھبوکا آنکھیں لیے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

کتنے ہی لمحے گزر گئے۔ وہ حیرت ودکھ سے اس کے طعنے سنتا اس کے اجڑے وجود کو دیکھتا رہا۔

”بولتے کیوں نہیں‘ مجھے برباد کرنے والے! جواب دو۔“

اس کی حالت دیکھ کر وہ اپنی صفائی میں اک لفظ نہ بول سکا۔ ”میں نے اپنا وجود تمہیں ودیعت کیا‘ میرا وجود تمہاری محبت کا اسیر تھا۔ پھر کیسے کسی اور کے حوالے کرتی۔ تمہیں ہی تو سونپی تھی اپنی محبت‘ جذبہ اور ہر اک احساس‘ پھر کیوں منہ موڑ کر بھاگ گئے بزدلوں‘ بے ہمت لوگوں کی طرح۔“

حمیرا کے ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچ گئے۔ وہ ساکت رہ گیا۔

”میری اس حالت کے ذمے دار تم ہو حسین رضا صرف تم۔“ وہ اسے جھنجوڑ رہی تھی۔ اس کے اندر اتنی ہمت نہ تھی کہ خود کو چھڑا سکے۔ وہ جب بولتے‘ چیختے‘ روتے‘ جھنجوڑتے تھک گئی تو خود ہی اس کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا‘ تھک کر زمین پر بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں میں دے کر سسکنے لگی۔

اس کے الجھے بال پورے وجود پر بکھر گئے۔ وہ چند ثانیے اسے یوں ہی دیکھتا رہا۔ پھر مرے مرے قدموں سے کمرے سے باہر نکل آیا۔

”بیٹا! اسے ایسے ہی دورے پڑتے ہیں۔ کوئی اس کے پاس جانے کی کوشش کرے تو دور ہی سے غرانے لگتی ہے۔ میرے قریب مت آؤ۔ میرے قریب مت آؤ۔“

اس کے جھکے سر‘ پھٹے گریبان کو تاسف سے دیکھ کر ملازمہ دکھ سے بولی۔ وہ اس کی دگرگوں حالت پر پشیمانی سے کلستا رہا۔ دل تو کر رہا تھا پہلے کی طرح طوطا چشمی کر کے یہاں سے بھاگ جائے۔ مگر وہ اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ بہرحال وہ اس کی محبت تھی اور اس کی محبت کی وجہ سے درد میں شریک رہے گا۔ دلجوئی کرے گا۔ یہ فیصلہ کرنے میں اس کے دل نے صرف اک لمحہ لگایا تھا۔

✡ ✡ ✡

”رشیدہ بہن! اتنے اچھے رشتے کروائے ہیں محلے کی لڑکیوں کے‘ بس میری ماہم پر ہی تیری نظر نہیں پڑتی۔“ چھوٹے سے صحن میں پڑے تخت پر دونوں پاؤں اوپر رکھ کر بیٹھی رشیدہ چائے کا کپ تخت کے کونے پر رکھتے آنکھیں سکوڑتے حیران ہوئی۔

”ارے کیوں خورشید! تیری بیٹی کی تو بچپن سے تیرے بھانجے کے ساتھ نسبت طے تھی۔“

”ارے تجھے نہیں پتا اس نے تو اپنے ساتھ پڑھنے والی ڈاکٹرنی سے بیاہ رچالیا۔“ صالحہ خالہ نے تاسف سے کہا۔ ”بس وہ دن آج کا دن‘ جیتے جی بہن ہمارے لیے مر گئی۔“

”اب پھر دکھڑے شروع۔“ ماہم جی بھر کے جھنجھلائی۔ اپنی بے وقعتی کا دکھ بھلانا بھی چاہے تو نہیں بھول پائی۔

”ارے کیوں دل چھوٹا کرتی ہے۔ کیا کمی ہے بھلا اپنی ماہم میں۔ خوب صورت‘ پڑھی لکھی‘ عمدہ اخلاق والی‘ ایک چھوڑ‘ دسیوں رشتے اس کے لیے۔“ رشیدہ نے انگلیوں میں پڑی انگوٹھیوں کی نمائش کرتے ہوئے ہاتھ لہرایا۔

”جانتی ہوں تمہیں بھی اور تمہارے تھرڈ کلاس رشتوں کو بھی۔“ وہ دانت پیستے بڑبڑائی‘ اور خود کو انتہائی ہینڈسم ہم سفر کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے دیکھنے لگی۔

”ارے کیا ہوا ماہم! بیٹھے بیٹھے سو گئی کیا؟“ آنکھیں کھول کر ناگواری سے ماں کو دیکھا۔

”تو استری رکھ کر کپڑوں پہ کھڑی ہے اور کوئی ہوش ہی نہیں۔“

اس نے چونک کر استری والا ہاتھ اوپر کیا۔ اکلوتے اچھے جوڑے کو جلا ہوا دیکھ کر دل مسوس کر رہ گئی۔

”ہائے ہائے ابھی پچھلے ماہ ہی تو آٹھ سو روپے کا سوٹ لایا تھا۔ وہ بھی جلا دیا۔ تجھے کیا قدر ہو گی ٹکڑے جوڑتے جوڑتے انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں میری۔“ وہ روہانسی ہو کر بولی۔

”اب جل گیا تو کیا کروں۔“ وہ جھنجھلائی۔ ”اماں چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی تم تو جان کو آجاتی ہو۔“ قمیص جلنے کا غم اوپر سے ماں کی نصیحتیں۔

”اب میں کیا پہن کر کالج جاؤں؟“

✡ ✡ ✡

”حمیرا کو اس حالت میں تنہا چھوڑ کر آپ ناانصافی کر رہے ہیں۔“ وہ زمین پر اس کے مقابل کھڑا اسے احساس دلا رہا تھا۔

”وہ آسیب زدہ ہے‘ کبھی ٹھیک نہیں ہو گی۔ اماں نے اپنی زندگی میں کوئی دعا‘ دوا نہ چھوڑی‘ ہر جتن کرنے کے بعد بھی اس کا مرض بڑھا ہے‘ گھٹا نہیں‘ بخشل بتا رہا تھا کہ اس نے تمہارے ساتھ بھی کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔“

وہ لاپروائی سے کہتے حد نگاہ تک پھیلے گندم کے سنہرے کھیتوں کو دیکھنے لگا۔

”وہ ذہنی مریضہ ہے۔“ چند لمحے کی خاموشی بعد وہ بولا۔ ”آپ کو اس کے علاج معالجے پر توجہ دینی چاہیے۔“

”اگر وہ علاج سے ٹھیک ہو سکتی ہے تو تم علاج کروالو اس کا‘ میری طرف سے اجازت ہے۔ مجھے دیکھ کر تو وہ مرنے مارنے پر تل جاتی ہے۔ اسی لیے میں نے گھر جانا ہی چھوڑ دیا۔“

”بھائی! وہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ علاج سے ٹھیک ہو جائے گی۔“

”دیکھو حسین رضا! میرے اوپر اور بھی ذمے داریاں ہیں۔ زمینوں کے حساب کتاب‘ مزارعوں کے مسائل‘ آس پاس کے زمین داروں سے چھوٹی چھوٹی چپقلشیں‘ کس کس بات کو دیکھوں‘ تم میرے بھائی ہو‘ کچھ تو میری ذمے داریاں بانٹو۔“

”ٹھیک ہے‘ میں اسے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتا ہوں‘ ہو سکتا ہے۔ وہ علاج سے ٹھیک ہو جائے۔ آپ ماسی حمیدہ کو ساتھ بھیج دیں۔“

وہ واپسی کے لیے پلٹا۔ بھائی کے ساتھ اس کی یہ تیسری ملاقات تھی جو حمیرا کے بارے میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔

✡ ✡ ✡

اس نے گھنٹہ گھر چوک پر سواری اتاری۔ اسی وقت ایک تنومند شخص رکشے میں آکر بیٹھا۔ تیل سے چپکے بال‘ بڑی بڑی مونچھیں‘ دھوتی باندھے اس شخص

کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا کہ پہلوان ہے۔ اس نے مسکرا کر سواری کو دیکھا۔

"کتھے جانا اے باجی؟"

"جھنگ روڈ تے کچھ اگے۔"

"اہیہ تے دور اے جی کرایہ زیادہ ہو گا۔"

"آہو جی! اسیں اپنا کرایہ دیواں گے کہ جی خوش ہو جائے گا۔"

اس کا رکشا جھنگ روڈ کی طرف رواں دواں تھا اور رکشہ چلانے والا 'پنج پانی دھرتی پر بسنے والے صوفیا کے کلام میں تسکین قلب کا متلاشی' اپنی تنہائی اور دنیا کی بے ثباتی کا نوحہ کرتا' بابا فرید گنج شکر کے دوہے گنگنا تا تھا۔

روڈ پر گاڑیوں کا شور تھا' مگر اندرونی فضا میں اس کی آواز کا سحر پہلوان جی کو آئینہ دکھا رہا تھا' وہ پریشان ہوا تھا اس حقیقت سے۔

"او باجی تسیں اوتھے رہندے سی؟"

اس نے گنج شکر کے دوہوں کی فضا سے نکل کر اسے بغور آئینے میں دیکھا۔

"بس جی! سفر تے پنجابیاں دے پیراں نال جڑ گیا اے" "مسافرت اناڈا من پسند مشغلہ اے۔"

"میں بھی پہلے لاہور میں رہتا تھا' پھر بدقسمتی سے حالات خراب ہو گئے' دھکے کھاتے کھاتے گوجرانوالہ' پھر سیالکوٹ' اب کافی عرصے سے فیصل آباد میں رہتے ہیں' آگے دیکھتے ہیں یہ سفر کراچی پر ختم ہو گا یا ابھی اور آگے جانا ہے۔ ہو سکتا ہے ادھر ہی ختم ہو جائے۔" وہ پنجابی میں بول رہا تھا۔

"بس بھاجی ادھر ہی روک دو۔ ہمارا سفر ختم ہو گیا۔"

اس نے رکشا روک کر کرایہ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مسافر نے اسے ہاتھ سے کھینچ کر پاس تیزی سے رکنے والی ویگن میں اٹھا کر ڈال دیا۔ یہ اتنا آناً "فاناً" ہوا کہ اسے سوچنے سمجھنے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔

✲ ✲ ✲

ملن کا سمے جب رت وصال میں مستقل مکین ہونے لگے تو محبت کرنے والے اپنی خوش نصیبی پر نازاں و فرحاں ہوتے ان سموں کو اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھ کر آنکھوں سے چنتے ہوئے دل میں محفوظ رکھتے ہیں۔

ان کے بیچ دائمی ملن کا موسم آیا تھا اور اس موسم کی نوید دینے ان کے دوست و احباب برقی قمقموں سے سجے ہال میں آموجود ہوئے۔ وہ محبت کی روشنیوں سے جگمگاتے چہرے کے ساتھ دلہن کے روپ میں مختصر حسنین کے دل میں اتر گئی۔

"اپنی قسمت پر یقین نہیں آتا۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے وفور مسرت سے بولا۔ وہ مسکرائی۔

"میرے غم دوراں کے دکھ' اپنوں کی کمی کا غم اور کرب تمہاری یہی مسکراہٹ مٹا دے گی۔"

اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی اپنے ہاتھ کو تھامے مختصر حسنین کے ہاتھ پر اس نے گرم جوشی سے دباؤ ڈالا۔

"میری ساری خوشیاں تمہاری اور تمہارے سارے غم میرے۔"

شب وصل وہ جو بیٹھے میرے پہلو میں
مسکرانے لگی شب مہتاب

دولہا نے کان کے قریب سرگوشی کی۔ وہ مسکرا کر محجوب ہوئی۔

ہاں اثر یہ ہوا محبت کا
ہم سے آنے لگا ہے ان کو حجاب

محبت سے چور آواز نے اس کو خوشیوں کے سنگیت کی نوید دے دیں۔

✲ ✲ ✲

"تم نے ایسا کیوں کیا حمیرا؟" لاہور پہنچنے پر اس کا بدلا رویہ دیکھ کر حیران ہوا۔

جب تک وہ کھانا اور کچن کی ضروری چیزیں لے آیا' تب تک ماسی حمیدہ نے چھوٹے سے فلیٹ کی صفائی کر دی۔ وہ بھی نہا کر صاف ستھرے لباس میں اجلی اجلی سی اس کے سامنے آبیٹھی۔

ماسی حمیدہ تھکی ہوئی تھی۔ کھانا کھا کر سو گئی تھی۔ ویسے بھی اسے ایم کھانے کی عادت تھی۔ گھوڑے بیچ کر سوتی تھی۔

"یہی سوال میں تم سے بھی کر سکتی ہوں حسین رضا! تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے بولی۔

"مجھے تو پتا ہی نہیں چلا' اماں نے بھائی کے لیے تمہارا رشتہ ڈال دیا' پتا چلا تو میرے ہاتھ کٹ چکے تھے میں کیا کرتا... مگر تم نے جو خود ساختہ پاگل پن خود پر طاری کر رکھا' کیوں خود پر ایسا عذاب مسلط کیا۔"

"محبت سے بڑی سزا اور ہجر سے بڑا کوئی عذاب ہو گا۔" وہ غائب دماغی سے بولی۔

"پھر بھی تم نے اچھا نہیں کیا۔" وہ گہری سانس بھر کر نفی میں سر ہلاتے بولا۔

"تم نے اچھا کیا... کبھی پلٹ کر خبر ہی نہ لی' میں کن حالوں میں ہوں۔"

"میں تمہاری ازدواجی زندگی میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ میں تمہیں بھول بیٹھا تھا' صرف یہ خیال تھا' اب تم اپنے شوہر کے ساتھ خوش رہو۔"

وہ اس سے نظریں چراتے بولا۔

"میری خوشیاں تو تم سے وابستہ تھیں' تمہاری دید سے منسلک... تم نے تو دیدار کے لیے ہی ترسا دیا... مجھے غصہ آتا جب تمہاری کوئی خیر خبر نہ ملتی' تب مجھے حسین رضا سے اور نفرت ہو جاتی' وہی تو جدائی کا سبب تھا۔" وہ یک ٹک اسے دیکھتے کرب سے گویا ہوئی۔

"تمہیں کبھی بھائی پر رحم نہیں آیا؟"

"مجھے تو خود پر رحم نہیں آیا۔ حسین رضا! تو وہ جو ہماری جدائی کا محرک بنا اس پر کیسے آتا۔ مجھے تو تمہارے وچھوڑے نے واقعی پاگل کر دیا۔ میں تو تمہاری تھی' پھر اس کی کیسے ہوتی۔ اسی لیے میں اس کی کبھی بن ہی نہ سکی' مرد تھا وہ' بالآخر مجھ پر مسلط ہو جاتا' اس کے تسلط سے آزادی کا اک یہی ذریعہ تھا' پاگل پن۔"

وہ وحشت سے بولتی رہی اور حسین رضا ہمدردی سے اسے دیکھتا رہا' وہ اس کی نہیں ہو کر بھی اسی کی رہی۔ اس کے دل میں اس کی قدر کچھ اور بڑھ گئی کہ وہ آج تک اس کے نام پر بیٹھی تھی۔ پہلے کی طرح' پہلے جیسی۔

✲ ✲ ✲

"تم واقعی اتنی خوب صورت ہو یا مجھے لگ رہی ہو؟" شب عروس میں حیا حسین کے دونوں ہاتھوں کو پکڑے مختصر حسنین حیرانی سے کہہ رہا تھا۔

"کیا اس کی وجہ بہترین ڈریس' جیولری یا میک اپ ہے... ہرگز نہیں مجھے تو ان کپڑوں میک اپ کا کوئی فرق ہی نہیں' صرف یہ کہ تم میرے دل کی ملکہ ہو۔"

حیا حسین کی آنکھیں وفور مسرت سے نم ہو گئیں۔

"حیا! تم میری زندگی کا واحد رشتہ ہو۔ میری زندگی تم سے شروع ہو کر تم ہی پر ختم ہوتی ہے... تمہیں پا کے مجھے لگ رہا ہے کہ میں مکمل ہو گیا ہوں' مجھے پوری کائنات مل گئی ہے۔"

خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی تھی۔

"کائنات تو میری مٹھی میں ہے۔" وہ شرما کے مسکرائی۔

مختصر حسنین نے اس کے ہاتھ میں اپنے ہاتھ کو دیکھا اور ہنس دیا۔

"میں نے محبت کی کائنات کو پا لیا ہے' چپ چاپ تمہیں دل میں بسایا اور قدرت نے مہرباں ہو کر تمہیں مجھے سونپ دیا۔" وہ جذب سے گویا ہوئی۔

"میری پوری کوشش ہو گی کہ زندگی میں تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہو۔ محبت کی کمی کا کوئی شکوہ نہ ہو۔ لوگ رشک کریں ہم پر' ہماری محبت پر' ہماری ہم سفری پر' بولو' وعدہ کرو' ہمیشہ میرا ساتھ دو گی؟" اس نے اس کے دونوں ہاتھ دبا کر وعدہ لیا۔

"میں تو سراپا تمہاری چاہت ہوں۔ حیا حسین اب حیا حسین نہیں رہی۔ حیا مختصر حسین بن گئی ہے۔ میں

تو کب کی ختم ہو گئی۔ تمہاری ذات میں ڈھل گئی۔ محبت نے مجھے موم کی طرح پگھلا دیا ہے' جس سانچے میں ڈھالو گے' ڈھل جاؤں گی۔"

"میں تمہیں اپنے دل کے سانچے میں ڈھالوں گا' تب تم میرا دل بن جاؤ گی' میں تمہیں اپنی آنکھ کے سانچے میں ڈھالوں گا تو میری نظر بن جاؤ گی۔" وہ کہنی کے بل نیم دراز ہو گیا۔

"میں تمہاری روح کے سانچے میں ڈھل جاؤں گی تو تم اپنا وجود تمہاری ذات میں گم کر بیٹھوں گی۔" وہ اس کے سامنے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"تو پھر آؤ۔ میں تمہیں اپنی روح کے سانچے میں ڈھال کر اپنا بنا لوں۔"

وہ اس کی شرارتی نظروں سے شرما گئی۔

زندگی اپنی ساری خوب صورتی' حسن' محبت کے ساتھ اس کے پہلو میں پڑی تھی اور سہاگ رات کی خوشبو اپنے مدھم سروں کی تان اس کے اردگرد بکھیرتی جاتی تھی۔

✡ ✡ ✡

"کیا تم مجھ سے شادی کر سکتے ہو؟" اخبار پڑھتے حسین رضا نے چونک کر حیرانی سے اسے دیکھا۔

"حمیرا... اپنی بات کا مطلب سمجھتی ہو؟"

"ہاں... سمجھتی ہوں۔" وہ تن کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"پاگل ہو تم..." وہ اخبار ٹیبل پر پٹخ کر اٹھا۔

"اس لیے نا کہ میں تمہارے بھائی کی بیوی ہوں۔ مگر میں نے کبھی اس نام و نہاد شادی کو تسلیم نہیں کیا۔ بندھن دل کا' دماغ کا' روح کا نہ ہو تو دنیا کا ہر قاعدہ قانون اس کو رد کرتا ہے۔"

وہ نظریں جھکا کر آہستگی سے گویا ہوئی۔

"تم میرے بھائی کی منکوحہ بیوی ہو تم نے سینکڑوں افراد کے سامنے اس بندھن کا اقرار کیا ہے۔ اس کی زر خرید لونڈی نہیں ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مضبوط لہجے میں بولا۔

"میں نے اس نکاح کو کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ نہیں مانتی معاشرے کے ان رسم و رواج کو جو ہندو معاشرے سے آئے ہیں اور جو عورت کو مورتی سمجھ کر کسی بھی کھونٹے سے باندھ دیتے ہیں۔ اسلام دلی رضامندی کو اہمیت دیتا ہے' جور و جبر کے جسمانی نکاح کو نہیں۔"

وہ ہذیانی انداز میں چیخ کر بولی پھر روتے ہوئے لجاجت سے کہنے لگی۔

"میں طلاق لے لوں گی' پھر تو راضی ہو جاؤ گے نا؟"

اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں نے اس کے دل کو نرم کیا۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"دیکھو حمیرا! مجھے تم سے ہمدردی بھی ہے اور محبت بھی۔ مگر تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں کس منہ سے بھائی کا سامنا کروں گا۔ دنیا کیا کہے گی' میں محبت پر عزت کو قربان نہیں کر سکتا۔"

"ہم گاؤں جائیں گے ہی نہیں' وہاں اپنے حصے کی زمین بیچ دینا تم۔ ہم اپنی دنیا الگ بسائیں گے۔"

وہ اپنی محبت کے ہاتھوں بے بس سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہم اس طرح کب تک رہیں گے۔ میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی حسین رضا! مر جاؤں گی' یا اب خود کو مار لوں گی۔ ختم کر دوں گی۔" وہ روتے روتے پھر ہذیانی ہوئی۔

"خدا کے لیے حمیرا! ایسی حرکت بھول کر بھی نہ کرنا۔ ورنہ میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔" وہ اس کی جنونی طبیعت سے واقف تھا' پریشان ہو کر بولا۔

✡ ✡ ✡

"آپا! کیا کروں... یہ لڑکی تو کسی بھی رشتے کے لیے مانتی ہی نہیں' چودہ جماعتیں پاس کر لی ہیں' پھر بھی کہتی ہے۔ ابھی اور پڑھنا ہے' میں اکیلی جان کب تک اس کا بوجھ ڈھوتی رہوں۔"

وہ سر پر پٹی باندھے اپنی ہمراز و ہمدرد بہن کے آگے

دکھڑا رونے بیٹھ گئی۔

"بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے خورشید! مگر غلط تیری بیٹی بھی نہیں۔" صالحہ خاتون نے ناک کی پھننگ پر کری عینک کو درست کرتے کہا۔

"آپا! بہت اونچا اڑنے کے خواب دیکھتی ہے۔ ڈرتی ہوں کہیں گر نہ جائے۔"

"اللہ نہ کرے خورشید! کیسی بدشگونی کی باتیں منہ سے نکالتی ہو اچھا ایسا کیوں نہ کریں اک چکر گاؤں کا لگا لیں ہو سکتا ہے' وہاں کوئی اچھا رشتہ مل جائے۔"

"آپا! اسے شہر کے لڑکے پسند نہیں آتے دیہاتیوں پر تو خاک بھی نہیں ڈالے گی۔" خورشید بددل ہو کر بولی۔

"ارے بس بھی کر خورشید! دنیا بہت بدل گئی ہے۔ کیا شہر' کیا گاؤں' سب آگے بڑھنے کی جستجو میں مگن ہیں' چل رشتہ نہ سہی' رشتے داروں سے ہی مل لیں گے۔ کتنے سال ہو گئے گاؤں کا چکر نہیں لگایا۔"

"ہاں آپا! جب سے ماہم کے ابا گم ہوئے۔ دوبارہ ہی گاؤں جانا ہوا' اب گاؤں میں بھی تو مزا نہیں رہا۔ ملکوں کا تو خاندان ہی تباہ ہو گیا۔ چھوٹے —— چودھریوں نے تو دنگا فساد برپا کر رکھا ہے' دل ہی نہیں کرتا جانے کو۔"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کر ماضی کی راکھ کریدنے لگی۔

"ہم کون سا ملکوں کی حویلی جائیں گے۔ وہ تو بڑی ملکانی کی موت کے بعد ہی ویران ہو گئی تھی۔ اب تو ہم بھی ان کے کمی نہیں رہے۔ اپنی مزدوری کرتے ہیں' کماتے ہیں' پردیس تو پردیس ہے' دل کھینچتا ہے' ان کھیتوں' پرانے گھروں کی جانب' جو اب کھنڈر بن چکے ہوں گے۔" صالحہ خاتون کا دل کر رہا تھا' پر لگ جائیں تو اڑ کر پہنچ جائیں۔

"اچھا ہے آپا!" ماہم بھی دیکھ لے گی کہ اس کا خاندان کوئی اونچے شملے والا نہیں' ملکوں کے کمی تھے کچے کوٹھوں میں بسنے والے' ہو سکتا ہے یہ دیکھ کر اونچے خواب آنکھوں میں بسانا چھوڑ دے۔" وہ دور کی کوڑی لائیں۔

"ارے چھوڑ خورشید! تیری بیٹی یہ باتیں نہیں سمجھے گی۔" وہ منہ پر دوپٹے کا پلو رکھتے ہنسنے لگیں۔

✡ ✡ ✡

"کبھی کبھار مجھے لگتا ہے' میں کسی یوٹوپیا میں آ گیا ہوں' جہاں سکھ ہی سکھ ہیں' محبت ہی محبت۔"

وہ مری میں بنے اپنے ذاتی ہٹ کی بالکونی میں کھڑے برف باری سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"محبت تمہاری رفاقت ہے' محبت تمہارا وجود ہے منتظر! ایسا لگتا ہے جیسے میں تو تھی ہی تمہاری منتظر!"

وہ اس کے اوور کوٹ کے کالر پر گرتی برف ہٹاتے بولی۔ اس نے اپنے بائیں کندھے سے برف ہٹاتے اس کے دائیں ہاتھ پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے زندگی سے بہت شکایات تھیں۔ مجھے لگتا تھا میری ذہانت کو غربت کھا جائے گی' مگر زندگی نے مجھے اتنا کچھ دیا کہ کبھی کبھی تو لگتا ہے۔ جیسے خوب صورت خواب دیکھ رہا ہوں۔ آنکھ کھلے گی تو یہ خواب ٹوٹ جائے گا۔ کہیں یہ سب چھن نہ جائے۔"

"یہ خواب نہیں ہے منتظر! تمہیں دیکھ کے تو مجھے محبت کا مفہوم سمجھ میں آیا ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔"

اس کے مدھم لہجے میں محبت کی تپش تھی۔

"تمہاری محبت میری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ میں تمہارا شریک زندگی ہی نہیں شریک محبت بھی ہوں حیا منتظر!" اس کے منہ سے سردی کی وجہ سے نکلنے والی بھاپ نے حیا کے بالوں کو چھوا' وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"اندر چلو یہاں بہت سردی ہے۔"

✡ ✡ ✡

"اندر کافی تپش ہے۔ سردی کا احساس کم ہو رہا ہے۔" وہ آتش دان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

وہ کافی بنا کر مڑی۔ اس کے چہرے پر سکون اور مسکراہٹ دیکھ کر اندر ہی اندر اسے گہری طمانیت محسوس ہوئی۔

"تمہیں اندازہ نہیں حیا! تمہارا اطمینان اور محبت مجھے کتنی خوشی دیتا ہے۔" کافی کے مگ کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

"زندگی کتنی خوبصورت ہو گئی ہے۔" خوشی سے حیا کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

"بالکل تمہارے وجود کی طرح۔" اس کے شانے پر اپنا بازو حمائل کر کے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

محبت کی تپش، آگ کی تپش، وجود کی تپش آپس میں گھل مل گئی۔ خوشبو نے ان کے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔

☼ ☼ ☼

حسنین رضا کسی کام سے شہر آیا تھا۔ وہاں حمیرا کو بہتر حالت میں دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی۔

حسنین رضا بھائی کو یوں اچانک دیکھ کر بوکھلا گیا۔

ماسی حمیدہ تو اپنی ماں کی بیماری کا سن کر ایک ہفتے بعد ہی چلی گئی تھی۔ اس کی ماں دوسرے گاؤں میں رہتی تھی۔ اس نے یہ بات حسنین رضا کو نہیں بتائی تھی۔

حمیرا اسے دیکھ کر فوراً" باورچی خانے میں چلی گئی تھی۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا، یہ وہی حمیرا ہے۔" وہ حسنین رضا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"بھائی! علاج سے کافی فائدہ ہوا ہے، ڈاکٹرز کافی پر امید ہیں۔" اس نے جھوٹ بولا۔ حالانکہ وہ ایک بار بھی ڈاکٹر کے پاس نہیں لے کر گیا تھا۔

"بہت اچھا بھئی بہت اچھا۔" وہ خوشی سے بولا۔

"اب تو میری حویلی آباد ہو جائے گی۔ زبیدہ کو میں نے ابھی تک ڈیرے پر ہی رکھا ہوا ہے کیونکہ حویلی مجھے آسیب زدہ لگتی ہے۔"

وہ سگریٹ کا کش لگاتے بولا۔

باورچی خانے میں پیچ و تاب کھاتی حمیرا مجبوراً" چائے بنانے لگی۔

"دل کر رہا ہے زہر ہو تو ڈال دوں حسنین رضا!" وہ دانت پیس کر بڑبڑائی۔

"بخشل کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ کچھ چیزیں لے کر ایک ہفتہ بعد آئے گا۔ ابھی ملی نہیں۔"

"جی بہتر بھائی!" وہ سعادت مندی سے بولا۔

"فصلوں کی کٹائی شروع ہو چکی ہے۔ واپس جانا ضروری ہے، کوشش کروں گا کہ اک ماہ تک آ جاؤں۔"

"جی بھائی! میں خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔"

"اچھا! کس سلسلے میں؟" وہ صوفے پر بیٹھا ٹانگ پر ٹانگ رکھتے بولا۔

"میں اب جاب نہیں کر سکتا۔ آپ زمین میں سے میرا حصہ دے دیں، تاکہ بیچ کر کوئی کاروبار شروع کر سکوں۔"

"کیا؟" وہ سیدھا ہو گیا۔ "تم آبائی زمین بیچ دو گے؟" اس نے حیرت و استعجاب سے استفسار کیا۔

"جی بھائی! نہ میں گاؤں میں رہ سکتا ہوں، نہ ہی زمین پر کام کر سکتا ہوں۔"

"حسنین رضا! میں تمہیں ملکوں کی سات پشتوں پر داغ لگانے کی اجازت کبھی نہیں دوں گا۔ اگر بیچو گے تو وہ بھی میں خریدوں گا۔" حتمی فیصلہ کر کے بولا۔

"ٹھیک ہے بھائی!" مجھے تو اپنے حصے کی رقم ہی چاہیے، آپ لے لیں تو زیادہ بہتر ہے۔" وہ کہہ کر مسکرایا۔ "اچھا ہے، اپنی زمین اپنے گھر ہی رہے گی۔ ارے بھئی یہ چائے کہاں رہ گئی۔" پھر اس نے فوراً" لہجے کو سنبھالا۔ "حمیرا بھابھی! چائے لے آئیں تاکہ بھائی کو یقین آ جائے کہ ان کی بیوی ٹھیک ہو رہی ہے۔"

اس نے ہنس کر باورچی کی طرف دیکھا۔ وہاں سے چائے کی ٹرے اٹھائے، حمیرا کی لال بھبھوکا آنکھیں دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر حسنین رضا نے ناامیدی سے سر کو نفی میں جنبش دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ ابھی تک مکمل ٹھیک نہیں ہے۔

☼ ☼ ☼

سیالکوٹ سے بس میں بیٹھ کر راجن پور کے سارے راستے وہ بور ہوتی رہی۔ رہ رہ کر خالہ اور اماں پر

غصہ آ رہا تھا، جن کو سالوں بعد اپنا گاؤں یاد آیا اور اسے زبردستی لے کر آئی تھیں، یہ بہانہ بنا کر کہ جوان جہان لڑکی کو پیچھے گھر میں اکیلا کیسے چھوڑ جائیں۔

تھکن سے چور وہ راجن پور کے بس اسٹاپ پر گاؤں جانے والے کسی رکشے کی متلاشی تھیں۔

"ابھی اور سفر کرنا ہے؟" وہ غصے سے بڑبڑائی۔

"ارے بیٹا! اب بس بھی کر، سارا راستہ منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ اب تو صرف آدھے گھنٹے کا راستہ ہے اے ہے وہ بھی دن تھے، جب ہم یہ راستہ پیدل طے کر کے اس روڈ پر آتے تھے پھر کہیں جانے کو بس ملتی تھی۔" صالحہ خاتون اسے نصیحت کرتے پرانے دور کی یاد کو تازہ کرنے لگیں۔

"لو مل گیا رکشا۔" خالو ابا کو رکشے میں آگے بیٹھے دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی۔

ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں بعد سبز چھوٹے چھوٹے کھیت دیکھ کر اسے یکدم خوشی کا احساس ہوا۔ شہر کی آلودگی سے پہلی بار نکل کر وہ گاؤں کو دیکھ رہی تھی۔ انہیں دیکھ کچے کوٹھوں سے نکلنے والی عورتوں کا اک غول ان کے گرد جمع ہو گیا۔

اس کی ماں اور خالہ ہنس ہنس کر ان سے گلے مل رہی تھیں، جبکہ وہ تھوڑی دلچسپی سے حیران ہو کر ان ملنے والیوں کو دیکھ رہی تھی۔ جو گلے ملتے ہی میل ملاپ نہ رکھنے کے کئی شکوے لے بیٹھی تھیں۔

"ارے خالہ خورشید! یہ تیری بیٹی ہے کیا؟" اک صحت مند لڑکی پراندہ جھلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں یہ میری بیٹی ہے۔ پوری سولہ جماعتیں پاس کی ہیں۔" وہ فخر سے بتانے لگی۔

"اچھا تو نوکری نہیں کرتی؟" استفسار ہوا۔

"ارے نوکریاں کہاں ملتی ہیں۔ آج کل اتنی آسانی سے۔" مایوسی اس کے لہجے سے ظاہر تھی۔

"ماسی! تو دل چھوٹا نہ کر، میری مالکن آج کل گاؤں آئی ہوئی ہے، میں اس سے تیری بیٹی کی نوکری کی بات کروں گی۔" بڑے پن سے دلاسا دیا۔ ماہم کی توجہ فوری طور پر اس پر گئی۔

"میرا نام زلیخا ہے۔" وہ خود ہی اپنا تعارف کرانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں، محبت آخر ہے کیا چیز۔ دو اجنبی انسانوں کے بیچ اگر قیام کرلے تو ساری دوری پاٹ دے۔ ساری اجنبیت کو ختم کر دے، نیست و نابود کر دے اور دو انسانوں کو یوں یکجا کرے کہ دوئی کی ساری حدیں ہی ختم ہو جائیں۔"

وہ استعجاب ـــــ سے بولتی رہی۔ وہ محبت سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ اتنے قریب بیٹھے تھے، جیسے ہاتھ کی دو انگلیاں۔ بھوربن ہوٹل کے اک خوبصورت کمرے میں وہ اپنی بیوی کو معصومیت سے بولتے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اک عجیب سرشاری و محبت تھی، جو وجود سے لپٹ کر ہنی مون کو حسین سے حسین تر بنا رہی تھی۔ ایک طرف جلتے ہیٹر کی گرمی کو ان کے تنفس کی گرمی مات دے رہی تھی۔

"تیرا محبت میں بھیگتا وجود محبت ہے۔
تیرے نازک سراپے کی اٹھان محبت ہے۔
تیرے بالوں کی درازی محبت ہے۔
تیری آنکھوں کا خمار محبت ہے۔
تیرے ہونٹوں کی لالی محبت ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"تیری یہ خوبصورت ہنسی، جو راہ چلتوں کو بھی دم سادھ کر رکھنے پر مجبور کر دے، یہ ہنسی محبت ہے۔"

"اچھا بس بس!" وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔

"اب پتا چلا محبت کیا ہے؟" وہ اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھتے بولا۔

"ہاں۔ میری آنکھوں میں بیٹھا منتظر حسنین محبت ہے۔"

"اور میری آنکھوں میں بیٹھی حیا حسین محبت ہے۔"

☼ ☼ ☼

احتیاط کرتے کرتے وہ دونوں تنگ آچکے تھے۔ وہ پہلے والی بے باکی نہیں دکھا سکتی تھی۔ اور وہ پہلے والی بے تکلفی سے پکارتے پکارتے رک جاتا۔ اک تو بخشل دوسری حمیدہ جو چند دن پہلے آگئی تھی۔

حمیدہ کو چھوٹا فلیٹ کھانے کو دوڑتا۔ بخشل کو شہر کا دھواں نہ بھاتا۔

"چھوٹے ملک جی! نہ باہر سکون ملتا ہے نہ ہی گھر میں باہر شور دھواں اندر دم گھٹنے لگتا ہے۔"

وہ دوپہر کو آکر ان کی ایسی ہی باتیں سننے پر مجبور تھا۔

گھر کے کاموں سے حمیرا نے دانستہ ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ بخشل سارے کام کرتا اور دوپہر کا کھانا وہ لے آتا رات کا بخشل اور حمیدہ مل کر بناتے۔

"چھوٹے ملک جی! آپ روزانہ باہر کا کھانا لے آتے ہیں۔"

"کیا کروں بخشل مجبوری ہے۔" وہ معنی خیزی سے حمیرا کو دیکھتے بولا جو پرانے حلیے میں آگئی تھی نہ بالوں میں کنگھا کرتی نہ کپڑے بدلتی۔

"میری بات مانیں تو اب شادی کرلیں۔ کب تک یہ بازاری کھانا کھاتے رہیں گے۔"

"بس کیا کروں۔ کوئی لڑکی ہی پسند نہیں آتی جس سے شادی کروں۔" اس نے ہنس کر حمیرا کو دیکھا۔

جس نے اسے نظر بچا کر آنکھیں دکھائی تھیں۔

حمیرا سخت چڑی ہوئی تھی کہ بخشل کیوں یہاں رہ رہا تھا۔ کھل کر بات کرنے کا موقع بھی نہ ملتا۔ مجبوراً وہ بھی رات کے پچھلے پہر جاکر حسین رضا کا پاؤں ہلا کر اسے جگاتی پھر اپنے غصے کا اظہار کرتی کہ ان دونوں کو "فوراً" روانہ کرو گاؤں۔

وہ ڈر کر اسے آہستہ بولنے کو کہتا۔

وہ اور بگڑتی۔

"تھوڑا صبر کرلو۔ زمین کا حساب کتاب لے لوں تو جان چھڑاؤں گا سب سے۔ اپنی بھی اور تمہاری بھی۔" وہ اسے دلاسا دیتا۔

ایسی ہی اک رات بخشل نے ان کو کھسر پسر کرتے دیکھ لیا۔

یہ تو پاگل حمیرا بالکل ہی نہیں لگ رہی تھی۔ سلیقے سے تیار بال بنائے نرمی سے بات کرتی حسین رضا کو محبت سے تکتی۔

بخشل کی تو آنکھیں ابلنے کو تھیں۔ تو یہ قصہ ہے صبح سارے منہ پہ پاؤڈر سرخی مل کر پاگل پن کے دورے کا صرف ڈراما ہے۔ کھڑکی کے سرکتے پردے کو دیکھ کر وہ سرعت سے اٹھا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے بخشل کی پیٹھ کو دیکھ کر وہ ڈر گیا۔

"آج ہم پکڑے گئے۔" اس نے حمیرا کو خوف زدہ لہجے میں بتایا۔

☼ ☼ ☼

وہ کافی سالوں بعد اپنے آبائی گاؤں گھومنے آئی تھی پوری فیملی سمیت۔ وہیں زلیخا سے اس کی دوستی ہوگئی۔ زلیخا ان کے پرانے نوکر کی بیٹی تھی۔ زلیخا کی دلچسپ باتیں ان کو جی بھر ہنساتی تھیں۔

وہی زلیخا اک صبح آئی تو اپنے ساتھ اک نازک و خوبصورت سی لڑکی کو لے آئی۔

"مہرین بی بی! یہ ہماری خورشید خالہ کی بیٹی ہے۔ بہت پڑھی لکھی ہے اس کو ناں کہیں نوکری دلادیں۔" اس کے منت بھرے لہجے پر وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

"اچھا کتنا پڑھا ہے۔"

"جی ایم اے فائنل کی تیاری ہے۔" وہ اعتماد سے بولی۔

"بیٹھو کھڑی کیوں ہو؟"

وہ اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"اوہو!" زمین پر بیٹھی زلیخا نے اس کی اس حرکت پر دوپٹا منہ پر رکھا۔

مہرین نے کافی دلچسپی سے ان دونوں کو دیکھا علم و شعور نے اسے ان کے برابر کردیا جو کمی کمین کہلاتے۔ اس کی تربیت کراچی کے ماحول میں ہوئی تھی اسے یہ بات بری نہ لگی۔

شام تک ان کے بیچ بے تکلفی بڑھ کر دوستی کی نہج پر پہنچ چکی تھی۔

مہرین نے موبائل نمبرز کا تبادلہ کرتے اسے یقین دلایا کہ وہ اپنی کزن حیا کی گارمنٹ فیکٹری میں اس کے لیے جاب کی کوشش کرے گی۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھوں پر بندھی پٹی نے موت کے خوف کو اور بڑھادیا تھا وہ ایسا قیدی تھا جو پھانسی گھاٹ جارہا تھا جس کا جرم صرف اک بے یارو مددگار بھانجے کو پال پوس کر جوان کرنا تھا۔

پھر بھی اسے یہ رنج کھائے جارہا تھا کہ مختر کو اس نے آخری بار نہیں دیکھا۔

"کاش!" وہ بڑبڑایا۔ "میرے جنازے کو مختر کا کاندھا نصیب ہوتا۔"

"فکر نہ کر حمید! تو عمر قید تو ضرور کاٹے گا پر موت کا مزا ادھر ہرگز نہیں۔" پہلوان ہنسا۔

"تیرے بڑے صاحب کا کیا بھروسا پہلوان جی! وہ تو سانپ ہے سگے رشتوں کو ڈس جانے والا میں تو اک غریب مسکین آدمی ہوں۔"

"ہاں بھئی ٹھیک کہتے ہو۔ غریبی اور مسکینی سے بڑی بدنصیبی آج کل کوئی نہیں ورنہ میں بھی تمہیں یہاں نہ ملتا۔" پہلوان نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"لگتا ہے رات آدھی سے زیادہ گزر چکی ہے۔" گاڑی کے اندر بڑھتی سردی کو محسوس کرتے گویا ہوا۔

"ہاں بھئی حمید! صبح کے لگ بھگ ہم بھی اپنی منزل پر پہنچ ہی جائیں گے۔"

باقی رات وہ گاڑی میں پہلوان کے خراٹوں کی آواز سنتا رہا اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے ہلنے جلنے کی مجال نہ تھی ورنہ ایسا پہلوان جو نیند کا رسیا ہو کے قبضے سے جان چھڑا کر چلتی گاڑی سے چھلانگ لگانا کون سا مشکل کام تھا۔

رہ رہ کر ڈرائیور کی کھانسی یا سگریٹ کا دھواں اسے کسی تیسرے فرد کی موجودگی کا پتا دیتا تھا۔

کہتے ہیں نیند کانٹوں پر بھی آجاتی ہے مگر اس رات وہ چاہنے کے باوجود سو نہیں پایا کہ موت کا خوف سر پر سوار تھا۔

وہ گاڑی سے اترا کچی زمین پر پاؤں پڑے گاڑی کے جانے کی آواز دور ہوئی۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو صبح کی پھیلتی روشنی میں آنکھیں چندھیا گئیں جب کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"بخشل۔۔۔ تو۔ یہاں۔۔۔"

☼ ☼ ☼

"پتا ہے میری مرحومہ ماں مہینے میں دوبار میرے لیے شامی کباب بناتی تھی۔" وہ جذب سے اس کا ہاتھ پکڑتے بولا۔

"دوبار کیوں زیادہ کیوں نہیں۔" وہ مسکرائی۔

"ہماری حیثیت ایسی نہیں تھی کہ وہ روز میرے لیے گوشت لے سکتیں۔" وہ لب بھینچ کر بولا۔

اسے اپنے بے ساختہ سوال کے بے ڈھنگے پن کا شدید احساس ہوا خفت مٹانے کو وہ مڑ کر کیبنٹ کھنگالنے لگی۔

"ماموں جو پیسے روزانہ کے خرچے کے دیتے اس سے چند روپے بچا کے رکھتیں جب آدھا کلو گوشت کے پیسے جمع ہوجاتے پھر شامی کباب یا بریانی بناتی۔" وہ گزری یادوں کو کھنگالتے بولا۔

"دل کرتا ہے مختر حسنین! میں تمہاری ساری محرومیوں کا ازالہ کردوں۔" وہ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں میں جھانکتے محبت سے بولی۔

"تم ہو نا میری محرومیوں کا ازالہ۔" اس کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا کر لبوں پر رکھا۔ "تمہیں پاکر تو یہ گماں تک نہیں ہوتا کہ زندگی میں اتنی مشکلات بھی تھیں۔ اگر تھیں بھی تو وہ تمہارے وجود محبت کی اک جنبش سے ختم ہوگئیں۔" اس کے لہجے میں جھانکتی خوشی نے اس کو سرتاپا سرشار کردیا۔

"اور میرے وجود کو مکمل کرنے والے تم ہو اس سے پہلے میں ادھورا دل لیے بے کل پھرتی تھی تمہیں پاکر لگا دل اک کائنات بن گیا ہے۔"

[illegible] اتنا خوش قسمت ہوں ٔمگر پھر تمہارا وجود مجھے یہ یقین دلاتا ہے اپنی خوش نصیبی کا۔ میں خدا کا شکر بجالا کر اپنی تقدیر پر نازاں ہونے لگتا ہوں۔

"ذرا یہ شامی کباب ٹیسٹ کرو تو اور زیادہ یقین آجائے گا۔" مسکرا کے اس نے شامی کباب اس کے منہ میں رکھا۔

"اور وہ بھی تمہارے ان نفیس ہاتھوں کا بنا ہوا۔ زبردست یار۔ ایمان سے تم اگر زہر بھی گھول دو گی تو اس میں بھی ذائقہ آجائے گا۔" وہ اسے گدگداتے بولا۔

"اف! کیا کررہے ہو۔" وہ گھبرا کر پلٹی۔ اس کی شرارت پر کھلکھلا کر ہنسی۔

باورچی خانے سے آتے قہقہوں پر حسین رضا نے مطمئن ہوکر بیوی کو دیکھا۔

"بہت خوش ہوں ان کو خوش دیکھ کر۔"

"اللہ دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔" حمیرا نے دل سے دعا کی۔

"آمین! ارے بھئی ہمیں بھی شامی کباب ملیں گے یا صرف اپنے میاں جی کو کھلاؤ گی؟" حسین رضا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"انکل! آپ کو میں کھلاؤں گا۔" مختشر نے کرسٹل ٹرے ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی' ہماری بیٹی تو اب صرف تمہیں ہی کھلائے گی' ہمیں تو بھول گئی۔" حمیرا نے ہنستے ہوئے خوش دلی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں آپ لوگوں کا خیال رکھنے کو مختشر ہے ناں؟" وہ کچن سے آتے بشاشت سے بولی۔

"جی بندہ حاضر ہے۔" مختشر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے کہا۔

وہ محبت سے اسے دیکھتے مسکرائی اور اس کی پلیٹ میں بریانی نکالنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"جی بھائی! تو پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا' زمین میں سے کتنا حصہ میرا آئے گا؟" ڈیڑھ ماہ بعد حسین رضا کے آنے پر چائے کا کپ سامنے رکھتے اس نے استفسار کیا۔

"پانچ سو ایکٹر کے پیسے تجھے مل جائیں گے۔" وہ چائے کا گھونٹ لیتے بولا۔

"پانچ سو کیوں بھائی! باقی زمین آپ بیچنے نہیں دیں گے کیا؟" وہ مسکرایا۔

"باقی زمین کا کیا مطلب۔ تمہارے حصے کے بنتے ہی پانچ سو ایکٹر ہیں۔" اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔

"کیا مطلب بھائی۔ چار ہزار ایکٹر میں سے صرف پانچ سو میرے حصے کے کیسے بنتے ہیں۔ جبکہ وارث صرف ہم دو بھائی ہیں" وہ حیرانی سے گویا ہوا۔

"دیکھ حسین! جو زمین ابا کی تھی' وہ تو انہوں نے بیچ کھائی۔ ابا کے شوق تو تم جانتے ہی ہو۔ ہمیشہ اماں کی زبانی' ذکر سنتے آئے کہ جائیداد کا بیشتر حصہ انہوں نے عیاشیوں کے پیچھے لٹادیا' باقی زمین میں نے اپنی محنت سے خریدی ہے۔" وہ سگریٹ کا کش لگاتے بولا۔

"مگر بھائی اگر خریدی بھی ہے تو کس سے؟ اسی زمین سے کما کر' یا اماں کی جمع پونجی سے تو اس میں بھی میں برابر کا حصے دار ہوں۔" وہ بددل ہوا۔

"دیکھ حسین! ساری محنت میں نے کی ہے۔ پانچ سو ایکٹر کے پیسے لیتا ہے تو لے ورنہ یہ لے اپنی زمین کے کاغذات خود بو کر کمائی سے جائیداد بنا' وارث بننا تو بہت آسان ہے۔ مگر محنت کرنا بہت مشکل۔" وہ طنزیہ بولا۔

"بھائی! اگر میرا کاروبار پانچ سو ایکٹر کے پیسوں سے اسٹارٹ ہوتا تو میں آپ کو کچھ نہ کہتا' مجھے تو اس سے آدھی رقم زیادہ چاہیے ٹیکسٹائل مل لگانے میں۔" اس نے مصلحت سے کام لیا۔

"اب تو جولاہوں والا کام کرے گا' کیا ہوگیا ہے حسین رضا! اس سے تو بہتر ہے ملک بن کر اپنی آبائی زمین آباد کر۔" اس کے چہرے پر غصے سے زیادہ نخوت کے آثار نمایاں تھے۔

"بھائی! میری سالوں کی پڑھائی تو اکارت جائے گی

اور ویسے بھی لڑکپن سے شہر کے ماحول میں رہا ہوں' اب دیہات میں نہیں رہ سکتا۔" اس کے چہرے پر تناؤ آگیا۔

"تمہاری مرضی ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"یہ بخشل کہاں چلا گیا؟"

"اسے میں نے سودا سلف لانے کے لیے بھیجا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں اسلام آباد جارہا ہوں' ہفتہ لگ جائے گا۔"

"بھائی! کھانا تو کھا کر جاتے۔" وہ اٹھ کر مصافحہ کرتے بولا۔

"نہیں کھانا میں اپنے دوست کے ہاں کھاؤں گا۔"

"اچھا ٹھیک ہے اللہ حافظ۔"

☆ ☆ ☆

"کراچی جو کبھی کولاچی ہوتا تھا' ماہی گیروں کا اک چھوٹا سا قصبہ ارتقائی منزلوں سے گزر کر اک عالمی بندرگاہ بن کر بہت وسیع القلب ہر ایک کی پناہ گاہ بن چکا تھا' کئی مدوجزر سے گزر کر اپنے اندر بدامنی چھپانے کے باوجود آج تک اس کی کشش برقرار تھی۔

وہ کراچی جس کی سڑکیں کبھی روز دھوئی جاتیں' ایسے دن بھی دیکھ چکا ہے' جن میں اس کی سڑکیں خون سے نہلائی گئیں۔ ایسا خون آلود کراچی بھی پاکستان کی ہر قومیت کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ آج تک پناہ دیتا ہے۔ ہم بھی کراچی آئے تو کراچی ہی کے ہوکے رہ گئے۔" مہرین نے اسے اپنے والدین کے ماضی کے بارے میں بتایا۔

وہ مہرین کے لان میں بیٹھی کراچی کی تاریخ دلچسپی سے سنتی رہی۔

"اسی کی دہائی کے بعد یہاں۔ صنعت کی تباہی شروع ہوئی' دہشت گردی بعد میں بھتہ خوری نے رہی سہی کسر نکال دی۔ آہستہ آہستہ یہاں سے ٹیکسٹائل انڈسٹری فیصل آباد منتقل ہوگئی' مگر آج بھی بیشتر ہیڈ آفسز کراچی میں ہی ہیں۔ اس شہر میں سب کچھ ہے' بس اک امن کی کمی ہے۔

"کراچی کے حالات پورے ملک کے لوگوں کو رنجیدہ رکھتے ہیں۔"

ماہم نے گہری سانس بھری۔

"ہم نے بھی اپنی ٹیکسٹائل ملیں جاکر فیصل آباد لگائیں۔ اب انکل حسین نے حیا کے نام گارمنٹ فیکٹری لگائی ہے' میں نے حیا سے بات کرلی ہے' تم کل جانا' وہاں مختشر تمہیں کہیں نہ کہیں ایڈجسٹ کرلے گا۔"

ملازم شام کی چائے کے ساتھ پکوڑے اور نمکو رکھ گیا تھا۔

"تھینک یو مہرین! میں آپ ہی کی دوستی اور ولا سے پر سیالکوٹ سے یہاں تک چلی آئی ہوں۔"

وہ پکوڑوں سے لطف اندوز ہوتے تشکر سے بولی۔

"ہاں بھئی اب دوستی کی ہے تو نبھائیں گے بھی' چلو میں آج تمہیں کراچی کا سمندر دکھاؤں۔"

☆ ☆ ☆

"تو تم نے ساری عمر یہاں گزار دی۔" حمید دکھ سے بولا۔

"ہاں زندہ رہنے کا اک یہی چارہ تھا۔" بخشل کے لہجے میں یاسیت تھی۔

"کبھی بیوی بیٹی یاد نہیں آئیں؟" حمید نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"بہت۔ جی کرتا ہے یہاں سے بھاگ جاؤں۔ ان کو جاکر دیکھوں' ملوں' لمحہ لمحہ سوچتا ہوں اب بیٹی اتنی بڑی ہوگئی' اب یہ کررہی ہوگی۔ وہ کررہی ہوں' پڑھ رہی ہوگی۔"

"پھر بھاگے کیوں نہیں؟"

"اگر میں بھاگ جاتا تو میرے پہنچ جانے سے پہلے انہیں قتل کردیا جاتا۔" اس کے چہرے پر اذیت تھی۔

"سوچتا' کیا ہوا جو دور ہوں' انہیں دیکھ نہیں پاتا مگر وہ بحفاظت خوش تو ہیں۔ ملک بہت ظالم ہے۔" وہ نفرت سے بولا۔ "یہ دولت اور طاقت بڑی منحوس

ہیں۔ انسان کو انسانیت کے درجے سے گرانے والی' بندہ پھر بندہ نہیں رہتا' خود کو خدا سمجھنے لگتا ہے۔"

"نعوذباللہ!" وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ بخشل کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔

"جب زندگی اور موت کے فیصلے بندہ اپنے ہاتھ میں لے لے تو بندہ بندہ نہیں رہتا' شیطان بن جاتا ہے۔ اللہ پاک کبھی نہ کبھی تو ایسے ابلیسوں کی رسی کھینچتا ہے' آخر موت تو انہیں بھی آنی ہے۔"

حمید نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"اچھا حمید! میں ذرا باہر کی ہوا کھا آؤں۔"

"میں تمہارے ساتھ نہیں نکل ـــ سکتا؟"

"آج پہلوان سے پوچھتا ہوں۔ اگر اجازت دے دی تو کل تم بھی ساتھ چلنا۔"

حمید کھڑکی کی سلاخوں سے اس کو باہر جاتے دیکھتا رہا' وہ چند فرلانگ دور پڑی چارپائی پر بیٹھا پہلوان سے بات کر رہا تھا۔

"پہلوان جی! حمید کی قید کب ختم ہوگی!"

"ارے بخشل تو درویش آدمی ہے۔ قابل بھروسا۔ کبھی بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ حمید پر ابھی اعتبار نہیں۔ کچھ عرصہ گزرے پھر دیکھیں گے۔"

"مجھے تو آج تک یہ پتا نہیں کہ یہ گاؤں کس تحصیل میں آتا ہے' کبھی کسی سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی' جب عمر ایسے ہی گزارنی ہے' تو پھر کیا فائدہ۔" وہ گہری سانس بھرتے بولا۔

"ہاں۔ ہاں تب ہی تو تم پر اعتماد ہے۔" بخشل جا کر برگد کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ اس کی شرٹ پر استری کر رہی تھی۔ منتظر گاؤن پہنے بال تولیے سے پونچھتا اس کے پاس آیا۔

"اتنے ملازم ہوتے ہوئے خود کام کیوں کرتی ہو۔"

"منتظر! تمہارے کام کر کے مجھے خوشی ہوتی ہے۔" مڑ کر آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے ہنس کر تولیہ اس کے شانوں پر رکھا۔ اور شرٹ اس کے ہاتھوں سے لے لی۔

اس تولیے میں اس کے محبوب کا لمس تھا۔ خوشبو تھی۔ وہ اک جذب کے عالم میں اسے سونگھنے لگی۔ منہ پر پھیرنے لگی۔ منتظر نے کف لنکس لگاتے اسے دیکھا۔

"میں تمہارے پاس ہوں' بہت قریب' دسترس میں' پھر ان بے جان چیزوں سے کیوں محبت کرتی ہو؟"

"اس میں تمہاری خوشبو ہے' یہ تولیہ بڑا معطر لگتا ہے۔"

"یہی تو کہہ رہا ہوں جان! مجھ سے محبت کرو' میری پرچھائیوں سے نہیں۔" وہ اسے شانے سے پکڑ کر قریب کرتے بولا۔

"تم سے محبت کی وجہ سے ہی تو تمہاری ہر بات' ہر چیز سے محبت ہے۔" منتظر پہ گڑی اس کی آنکھوں میں محبت روشنی بن کر چمکی۔

منتظر نے وفور مسرت سے لب بھینچ کر آنکھیں موندیں۔ گہری سانس محبت بن کر اس کے چہرے سے ٹکرائی۔

"اتنی محبت... میں پاگل ہو جاؤں گا حیا!" وہ ٹھہر ٹھہر کے بولا۔ اس کے لہجے میں پیاسے مسافر کی تھکن تھی جو پانی پا کے سیراب ہو۔

دروازہ پہ دستک ہوئی۔

"بیگم صاحبہ اور صاحب جی آپ لوگوں کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ان دونوں کو ناشتے کی ٹیبل پر آتے دیکھ کر وہ دونوں مسکرائے۔

"بیٹا! حیا کے ساتھ تمہیں خوش دیکھ کر میری رگوں میں زندگی دوڑ جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے سارے گناہوں کا کفارہ ادا ہو گیا ہو۔" وہ ان کے چہروں پر نگاہیں مرکوز کرتے بولے۔

"اور میں بھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں جس نے میری بیٹی کی زندگی خوشیوں سے بھر دی ہے۔" حمیرا نے چائے کپ میں ڈالتے محبت سے دیکھا۔

"ہم دونوں اور ہماری زندگی آپ کے گناہوں کا

کفارہ نہیں' نیکیوں کا صلہ ہے بابا جان!" حیا کے چہرے پر والدین کے لیے محبت ہی محبت تھی۔

"صحیح انکل! آپ لوگ تو فرشتہ صفت ہیں' اس بات کو مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے۔ ہر ماہ مخصوص رقم کے چیک مختلف فلاحی اداروں کو میں ہی ارسال کرتا ہوں۔"

منتظر چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"ارے نہیں بیٹا! ہم تو گناہ گار ہیں۔ بس اللہ نے کچھ نیک کام کرنے کی توفیق دی ہے۔ ان میں سے ایک نیکی تم بھی ہو۔" وہ بہت گہرے لہجے میں بولے۔

"اور میں سمجھتا ہوں' میرے ماں باپ کی پتا نہیں کون سی نیکی ہے جو مجھے اتنی محبتیں ملی ہیں۔ کیوں آنٹی! ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" اس نے تھوڑی خاموش' تھوڑی گم صم حمیرا کو مخاطب کیا۔

"ہوں... ہاں... ہاں!" وہ اچانک اس سوال پر بوکھلا گئیں۔

ان دونوں نے اپنے بزرگوں کو دیکھ کر محبت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

☼ ☼ ☼

"ہائے... چار ہزار ایکڑ میں سے صرف پانچ سو ایکڑ دے رہا ہے تمہیں۔ دیکھا حسین! تمہارا بھائی دغا کر رہا ہے تمہارے ساتھ... میں کہتی تھی نا جیسا تم اسے سمجھتے ہو' ویسا نہیں وہ۔" اس نے لوہا گرم دیکھ کر ہتھوڑا رسید کیا۔

"مجھے خود یقین نہیں آتا' بھائی میرے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں۔" وہ تاسف سے گویا ہوا۔

"تم تو ہو ہی بھولے۔ محبت کی پٹی اتار کر دیکھو تو تمہیں حسنین رضا کی اصل صورت نظر آئے۔" وہ نفرت سے بولی۔ "پہلے تمہاری محبت پر قبضہ کیا' اب ملکیت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔"

حسنین رضا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ متفق تھا اس کی بات سے۔

وہ زبیدہ کو بخشل کے ساتھ اسپتال میں چھوڑ کر آگیا تاکہ تنہائی میں حمیرا سے صلاح و مشورہ کر سکے۔ اس رات کے بعد وہ کافی محتاط ہو گئے تھے۔ حسنین رضا کے آنے میں اک دن تھا۔ وہ زبیدہ کو جانے سے پہلے لیڈی ڈاکٹر کو اک بار دکھانے کا مشورہ دے کر تنہا ہونا چاہتا تھا۔

جب سے حسنین رضا گیا تھا۔ غصے کا لاوا ابل رہا تھا اس کے اندر۔ رہ رہ کر اسے غصہ آ رہا تھا کہ وہ اتنے سال اپنا حق وصول کرنے کیوں نہ گیا۔ جائیداد کا فیصلہ ماں کی زندگی میں کیوں نہ کر لیا۔

حمیرا نے بغور اس کی پیشانی پر شکنوں کے جال کو دیکھا۔

"دیکھو حسین' تمہارا بھائی دھوکے باز اور جھوٹا ہے۔ میں نے خود پھوپھی کو کہتے سنا تھا کہ حسین کے حصہ کی زمین دو ہزار ایکڑ ہے اب وہ صرف پانچ سو پر تمہیں ٹرخا رہا ہے۔"

مسلسل ضربوں پر لوہا نرم ہو رہا تھا۔

"میں سمجھتا تھا میرا بڑا بھائی جائیداد کو محنت محبت سے سنبھال بھی رہا ہے اور بڑھا بھی رہا ہے۔"

"غلطی تو تمہاری ہی تھی' تم ہی کور چشم نکلے۔ اعتبار کے اندھے پن کا شکار۔ تم نے محبت و ملکیت دونوں کی خبر نہ رکھ کر خود پر ظلم کیا اور بے خبری میں مارے گئے۔" وہ اس کے مضبوط لہجے پر اسے دیکھتا رہ گیا۔

"میں کیا کرتا۔ تم میرے بھائی کی بیوی تھیں۔ یہ میری مجبوری اور بے بسی ہی تھی' جس نے مجھے گاؤں آنے سے روکا۔ میں جائیداد وغیرہ کے معاملات کو بھی نہ دیکھ پایا۔ فرار کی راہ اختیار کی خود سے' تم سے' حالات سے۔" وہ دکھ سے گویا ہوا۔

"میں اس کی تھی ہی نہیں۔ رشتہ وہ ہوتا ہے جو انسان قبول کرلے' میرے دل' روح' ذہن' عقل نے اسے شروع دن سے ہی تسلیم نہیں کیا۔ تم بغاوت تو کرتے... میں ہر حال میں تمہارا ساتھ دیتی۔ میں کل بھی تمہاری تھی اور آج بھی تمہاری ہوں۔ میں بھی حسنین کے ساتھ نہیں جاؤں گی' اگر کسی نے ایسی

کوشش کی تو ماردوں گی اسے بھی اور خود کو بھی۔“ اس کا حتمی لہجہ اسے سوچنے پر مجبور کر گیا۔

”میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔“ وہ بے تاب ہوا۔ حمیرا بے ساختہ مسکرائی۔

”ہاں ہمارا ملاپ تو ہو کے ہی رہے گا‘ مگر فی الحال یہ سوچنا ہے کہ جائیداد میں پورا حصہ کیسے وصول کیا جائے۔“ وہ پرسوچ انداز میں گویا ہوئی۔

”ہاں بہت سوچا ہے‘ مگر کوئی حل سمجھ میں نہیں آیا۔“ وہ پیشانی ملنے لگا۔

”حل تو ہے میرے ذہن میں بس تم راضی ہو جاؤ تو سارے مسئلے ختم‘ ساری پریشانیاں دور۔“ وہ پراسرار انداز میں بولی۔ حسین رضا نے بغور اسے دیکھا۔

”کون سا حل؟“

”تم میرے منصوبے کے تحت عمل کرتے رہو‘ کوئی سوال نہ پوچھو۔“

اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر حسین نے لب بھینچ کر بھنویں سکیڑتے اسے دیکھا۔

”وعدہ؟“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔

وہ چند ثانیے خاموش رہا پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”ہاں پکا وعدہ اک مرد کا۔“

☼ ☼ ☼

وہ فائل کھولے بیرون ملک سے آنے والے مختلف آرڈرز کا معائنہ کر رہا تھا‘ جب حیا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

”منتظر! فارغ ہو؟“

”تمہارے لیے تو ہر مصروفیت چھوڑ سکتا ہوں۔“

اس نے فائل بند کر کے اسے دیکھا۔ وہ سامنے کھڑی لڑکی کی طرف متوجہ تھی۔

”یہ میری نئی سیکریٹری ہیں مس ماہم! جس کی تم نے سفارش کی تھی۔“ وہ اٹھتے ہوئے مسکرایا۔

”اچھا جس کے لیے مہرین نے کہا تھا۔“

”ہاں اور مس ماہم! یہ میری وائف ہیں۔ حیا منتظر حسنین۔“ اس نے تعارف کرایا۔

”جی السلام علیکم۔“ وہ سر کو جنبش دیتے بولی۔

”وعلیکم السلام!“ اس نے ہنستے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ”ابھی جلدی میں ہوں ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔“

”جی جی ضرور۔ ضرور۔“ وہ حیا کے دوستانہ انداز پر اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے بولی۔

”پرانی سیکریٹری کو فارغ کر دیا؟“ گاڑی میں بیٹھتے استفسار کیا۔

”نہیں‘ وہ پریگننسی کی وجہ سے چار ماہ کی چھٹی پر ہے‘ وہ آئے گی تو میں ماہم کو کہیں اور ایڈجسٹ کرلوں گا۔ فی الحال تو تمہارا حکم تھا سو تعمیل ضروری تھی۔“ وہ گیئر لگاتے اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”اچھا!“

وہ اس کی دلفریب مسکراہٹ کو کئی ثانیے محبت سے دیکھتی رہی۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“

”تمہارا ساتھ رہا تو زندگی کتنی حسین و خوشگوار گزرے گی۔“ وہ جذب سے گویا ہوئی۔

”ہوں!“ وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

”محبت کے سامنے ہر جذبہ ہر احساس فضول لگتا ہے۔“ منتظر کو دیکھتے اسے ماں کی بات یاد آئی۔

”ماں بننے کے بعد نہ آنکھ میں نیند اترتی ہے نہ دل میں سکون۔ محو دعا لب بے سکونی کو تھپک تھپک کر پُرسکون کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماں کی ممتا بڑا عجیب جذبہ ہے‘ ہر چیز پر دکھ بھلا دینے والا۔“

”امی! یہ آپ کی محبت کی شدت ہے‘ ورنہ ہر ماں ایسی تو نہیں ہوتی۔“ اس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کے کہا تھا۔

مگر اب سمجھ میں آرہا تھا کہ محبت کسی بھی رنگ میں ہو اس کے احساسات ایک جیسے رہتے ہیں۔ محبت کی قسمت میں بے چینی اور بے سکونی ہی لکھی ہے۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ منتظر نے اسے گم صم دیکھ کر استفسار کیا۔

اس نے چونک کر اپنے ساتھ بیٹھے ڈرائیونگ

کرتے منتظر کو اسی محویت سے دیکھا۔

”تمہیں اور محبت کو۔“

اس نے گیئر لگاتے منتظر کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

برگد کی گھنی چھاؤں میں موٹے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھا بخشل منتظر تھا اس دیوانی جھلی لڑکی کا جو بارہا اس سے دعا مانگ گئی تھی کہ پہلوان کے منجھلے بیٹے سے اس کی شادی ہو جائے۔

وہ ہر بار اس نمانی نار کو دیکھ کر مسکرا دیتا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر فون نمبر لکھا تھا۔

”بابا جی تسی دعا کرو میڈا پریم مینوں مل جائے۔“ وہ آگئی۔

”میں وظیفہ پڑھوں گا‘ تیری مراد بر آئے گی‘ مگر تجھے میرا ایک کام کرنا ہوگا۔“

”مجھے ہر شرط منظور ہے۔“ بے تابی اور رسوا ہوئی۔

اس نے اردگرد دیکھا۔ آئی گرمیوں کی دوپہریں ابھی سے سنسان تھیں کوئی ذی روح نہ تھا۔

”مجھے ایک فون کرنا ہے۔ ایک دن کے لیے فون لا دے۔“

”بس۔ اتنی سی بات بابا جی!“ وہ خوشی سے نہال ہوئی۔ ”یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اس سے کہہ کر منگوا دوں گی۔“

”ہاں مگر راز راز ہی رہے یوں۔ جیسے تمہارا راز میرے پاس راز ہے۔“ بخشل کی انگلی تنبیہا اٹھی۔

”بابا جی! اس کی تو فکر نہ کر۔ تو بس ہماری شادی کے لیے آج سے وظیفہ پڑھنا شروع کر دے۔“

”کر رہا ہوں۔“

”بہت بہت مہربانی بابا جی!“

☼ ☼ ☼

اس نے سامنے بیٹھی عورت کو نفرت سے دیکھا تھا۔ اس کا خوب صورت‘ باوقار چہرہ اچانک بھیانک ہوا جس پر نحوست کے سائے منڈلا رہے ہوں۔

ماضی کی یادیں یادداشت کے کواڑ توڑ کر آوارد ہوئیں۔ اس کی نمانی ماں جو کبھی سلائی مشین سے سر اٹھا کر خلا میں گھورتی۔ اکثر ایسا کرنے پر وہ ان کی خود کلامی سننے کی کوشش کرتا۔

”ڈائن ہے تو ڈائن۔۔۔ پچھل پیری! تو نے میرا گھر اجاڑ دیا۔ میری زندگی برباد کر دی۔ تو سکھی نہیں رہے گی تو بھی سکھی نہیں رہے گی۔“

تب سے آج تک اسے اس ڈائن کی تلاش رہی تھی۔ وہ ڈائن آج اس کے سامنے تھی اور بے فکر‘ سکھی‘ خوش تھی۔

اس کا دل چاہا وہ اسے قتل کر دے‘ مگر دوسرے ہی لمحے اس خیال کو جھٹک دیا۔ اسے ماموں تک پہنچنا تھا۔

حیا چائے لے کر آنے والی تھی اور اس کے آنے سے پہلے ہی وہ سرعت سے باہر نکل آیا۔

☼ ☼ ☼

”منتظر!“ چائے کا کپ تھامے حیا سارے گھر میں اسے پکارتی اور ڈھونڈتی رہی۔

”آخر کہاں چلا گیا؟“

سیل فون بند جا رہا تھا۔

وہ لان میں لگے نئے پودوں کے بارے میں مالی سے معلومات لیتی رہی۔

”السلام علیکم۔۔۔ کیا ہو رہا ہے؟“ مہرین کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا اور کھل اٹھی۔

”ارے واہ! آج صبح ہی صبح کیسے راہ بھول گئیں۔“ وہ اس سے گلے ملتے بولی۔

”دانی کو اسکول چھوڑنے گئی تھی‘ سوچا گھر جانے سے پہلے تم سے ملتی چلوں۔۔۔“ وہ لان میں پڑی کرسی پر بیٹھتے بولی۔ اس نے ملازم کو چائے لانے کا کہا۔

”ہاں یاد آیا۔ تم نے میرے کہنے پر اس لڑکی کو ملازمت دی بلکہ اس کی رہائش کا انتظام بھی کر دیا۔ اس کی ماں بہت دعائیں دے رہی تھی۔“

"کون دعاؤں ؟ ... تمہیں تو منتظر ہے، جو اپنے ایمپلائز کا اتنا خیال رکھتا ہے۔"

"وہ ملیں گے تو ان کا بھی شکریہ ادا کردوں گی۔"

"اچھا بس! دوستوں میں شکریہ نہیں ہوتا۔ تم نے اک کام کہا میں نے کردیا۔ کوئی بڑی بات نہیں۔"

☼ ☼ ☼

وہ پریشان تھی۔ منتظر سے اک ہفتے سے کوئی تفصیلی بات نہ ہوپائی تھی، وہ مختصربات کرکے فون رکھ دیتا۔ کبھی ایک آدھ میسج پڑھا دیتا۔ اس کا سیل اکثر بند ملتا۔ وہ جھنجلا جاتی۔ اس کی اتنی جدائی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

امی روز اس سے منتظر کے بارے میں پوچھتیں۔ وہ روزانہ انہیں مختلف بہانے کام کی مصروفیت، مشینوں کے سودے وغیرہ کا بتا کر مطمئن کردیتی۔

اسے محسوس ہوتا کہ امی اس کے چہرے پر لکھی کوئی تحریر پڑھنا چاہتی ہیں۔ ان کی کرید بڑھتی جارہی تھی۔ اس کے لیے ماں کا رویہ بھی حیران کن تھا۔ وہ اس کی طرف سے شادی کے بعد کچھ زیادہ ہی پریشان رہی تھیں۔

"شاید شادی کے بعد ماؤں کو یہ احساس زیادہ ستاتا ہے کہ بیٹیاں اب پرائی ہوگئی ہیں کسی اور کے اختیار میں کسی اور کی ماتحت، مگر میرے ساتھ تو ایسا کچھ نہیں ہے۔ منتظر بے حد خیال رکھنے والا اور محبت کرنے والا ہے۔"

وہ سوچ کر مطمئن ہوجاتی مگر اب منتظر کا ہجر اس سے برداشت نہیں ہورہا تھا۔

"میں چند دن کے لیے فارغ ہوں، تم فوراً" پہلی فلائٹ سے پہنچو، تاکہ کچھ وقت اکٹھے گھومنے پھرنے میں گزاریں۔"

وہ فون پر وصل کی نوید سن کر فوراً" پیکنگ میں جُت گئی۔

"بیٹا! اپنا بہت خیال رکھنا اور مجھے اپنی خیریت کی اطلاع دیتی رہنا۔"

"جی امی! میں اپنے شوہر کے پاس جارہی ہوں، کہیں اور نہیں، آپ کیوں اتنی پریشان ہورہی ہیں۔" وہ ان کو متفکر دیکھ کر ہنستے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

"ہاں بیٹا! ماں ہوں اور ماؤں کا دل کبھی بھی اولاد کی طرف سے مطمئن نہیں ہوتا۔"

"امی! یہ صرف آپ کا مسئلہ نہیں ہر محبت کرنے والے کا مسئلہ ہے، میں بھی جان گئی ہوں یہ کیفیات۔ جب سے منتظر سے محبت کی ہے۔" وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر بولی۔

"اللہ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے اور ہمیشہ ایک دوسرے سے اتنی ہی محبت کرو، زندگی ہنسی خوشی گزرے۔"

"آمین، بالکل ایسے جیسے آپ کی اور بابا کی۔" وہ شرارت سے کھلکھلائی۔

"اللہ کی پناہ میں۔" انہوں نے کہتے گاڑی کا دروازہ بند کیا۔

☼ ☼ ☼

وہ تین دن اکٹھے اسلام آباد میں گھومتے رہے۔ اس کے بعد وہ لاہور آگئے، دو دن وہاں رہے، وہ خود ہی فون کرکے ماں باپ کو خیریت کی اطلاع دیتی رہی، کیونکہ منتظر نے اسے سیل آف رکھنے کو کہا تھا۔ اپنا بھی وہ بند ہی رکھتا۔ وہ اکثر جھنجلا کر کہتا۔

"یہ موبائل فون ایسی بلا ہے جس کے ہوتے کوئی پرائیویسی نہیں رہتی۔ خلوت ہو یا جلوت، ہر وقت بجتا ہی رہتا ہے۔ سو اس کا بند رہنا ہی بہتر ہے جب تک ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔"

وہ اس کی باتوں پر کتنی ہی دیر ہنستی رہی۔ زیادہ تر فون بند ہی رکھتی۔ آن کرکے ماں کو فون کرتی۔

وہ بذریعہ ٹرین ملتان جارہے تھے۔

"ٹرین ہی کیوں؟" اس نے حیرت سے منتظر کو دیکھا۔

"ارے یار! وہ سفر تو گھنٹوں میں ختم ہوجاتا ہے۔

میں تمہاری سنگت میں لمبا سفر کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ زندگی بھر یادگار رہے۔"

اور واقعی ٹرین کا سفر یادگار رہا۔

منتظر کی توجہ و محبت پر وہ خوشی سے جھوم جھوم جاتی۔

☼ ☼ ☼

"تم تو واقعی میرا چاند ہو بیٹا! اتنی اچھی ملازمت اور اتنا اچھا گھر۔" خورشید فلیٹ میں گھومتے مسرور ہوئی۔

"اماں! انسان کوشش کرے تو سب کچھ پاسکتا ہے ابھی تو میرا ترقی کا سفر شروع ہوا ہے۔ یہ فلیٹ میری منزل نہیں۔" وہ عزم سے بولی۔

"ہاں اللہ تمہیں اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔ مجھے تم پر واقعی فخر محسوس ہوتا ہے، کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اپنا گھر بھی ہوسکتا ہے۔" وہ خوشی سے نم آنکھیں پونچھنے لگیں۔

"اماں یہ اپنا نہیں مگر میں چند سالوں میں اپنا بھی خرید لوں گی۔"

"ان شاء اللہ، ضرور اللہ تمہاری یہ امید بھی پوری کرے گا، اچھا بیٹا یہ سامان تم نے خریدا ہے؟" وہ اک اک چیز کو غور سے دیکھتے بولی۔

"نہیں اماں، یہ ڈیکوریٹڈ ہی ملا ہے۔" وہ ہنستے بولی۔

"اب تو میں بھی آپا کو اپنے پاس بلالوں گی اور جی بھر کے ان کی خدمت کروں گی اور سارے احسانات کا بدلہ چکاؤں گی۔" خورشید آئندہ کے منصوبے بنانے لگی۔

"ہاں اماں! ضرور۔"

☼ ☼ ☼

"پتا نہیں کیا ہوا؟ اتنے دن ہوگئے نہ کوئی فون آیا نہ منتظر میاں آئے۔ اللہ کرے خیریت سے ہو۔"

حمید کی سرگوشی پر بخشل نے دروازے کی طرف دیکھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا، وہاں کسی کو نہ پاکر اطمینان کی سانس لی۔

"مجھے ڈر ہے کہ جذبات میں آکر منتظر کوئی جذباتی

قدم نہ اٹھا بیٹھے۔" اک وہم اور وسوسہ حمید کے اندر سر اٹھانے لگا۔

"یار! کیوں ناامید ہوتے ہو۔ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔" وہ اس کے خدشات کو نظرانداز کرکے بولا۔

"پتا نہیں اللہ کی رحمت کس وقت جوش میں آجائے' وہ سارے بند دروازے کھول دے۔"

حمید زور زور سے اثبات میں سرہلانے لگا۔ "میری تو پھر بھی خیر ہے تھوڑا عرصہ ہوا ہے قید کو مگر تم نے تو ساری عمر اس قید و بند میں گزار دی۔" وہ ایک بار پھر مایوس ہوا۔

بخشل کے لبوں پر پُراسرار مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے حمید میاں! اگر میں قید نہ ہوتا تو نشئی چرسی بنا رہتا اس قید نے مجھے اللہ کے قریب کردیا اس تنہائی میں میرا ہمراز ہمدم' دوست میرا رب ہمیشہ میرے ساتھ ہوتا ہے میں اپنے سارے دکھڑے اس کے سامنے بیان کرتا ہوں' وہ میرے دل بے قرار پر اطمینان کا نزول فرماتا ہے تو کوئی دکھ' دکھ نہ رہتا' کوئی قید' قید نہیں رہتی۔ میں اس سے اپنی تنہائیاں بانٹتا' اس سے رحم مانگتا' اپنی بیٹی کے لیے دعائیں مانگتا اور مجھے لگتا میرے رب نے میری ساری دعائیں قبول کرلی ہیں۔ مجھے لگتا ہے میری بیٹی جہاں بھی ہے' بہت خوش ہے اور خوش رہے گی۔"

اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر حمید کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"ہاں کہتے تو تم بھی ٹھیک ہو۔ یہاں کا بخشل اس بخشل سے یکسر مختلف ہے' جو پی پلا کر راتوں کو گلیوں میں پڑا رہتا تھا۔"

"اور یہ بھی دیکھو کہ اللہ نے اس کے دل میں رحم ڈالا اور ہمیں زندہ رکھا۔ اس نے تمہیں بھی قتل نہیں کروایا۔ میرے ساتھ قیدی بنالیا۔"

"بے شک بخشل! بے شک۔ یہ میرے مالک کریم کا احسان ہے۔" حمید کے دل پر کچھ دیر پہلے چھائی اداسی کے بادل چھٹنے لگے' یاسیت کی جگہ امید نے قدم رکھ دیے تھے۔

☆ ☆ ☆

"پتا نہیں کیوں دل حیا کی طرف سے پریشان رہتا ہے' عجیب وسوسے واہمے گھیرے رہتے ہیں۔" وہ انہیں دودھ کا گلاس تھماتے ہوئے بولیں۔

"کیوں کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی ہے کیا؟" انہوں نے بغور بیوی کو دیکھا۔

"نہیں بات تو کوئی نہیں ہوئی مگر۔۔۔"

"تو پھر خواہ مخواہ پریشانی کیوں؟" انہوں نے بات درمیان میں کاٹ دی۔ "حیا خوش ہے شوہر کے ساتھ۔ اسے کوئی مسئلہ نہیں۔" انہوں نے چشمہ اتار کر مطالعے کے لیے کھولی کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

"یہی تو مسئلہ ہے کہ ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہ واقعی خوش ہے یا دکھتی ہے۔"

"اف بیگم صاحبہ! آپ تو واقعی پاگل ہوگئی ہیں۔ وہم کا علاج مجھ غریب کے پاس کیا حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں ہوگا۔" وہ دل کھول کر ہنسے۔

"اسی پاگل پن میں تو آپ کو پایا تھا۔" وہ مصنوعی ناراضی سے بولیں۔

"جی ہاں اور ہمیں بھی پاگل کردیا۔" وہ متبسم ہوئے۔

"بڑا دانا سمجھتے تھے خود کو۔" وہ مسکرائے جتانے والے انداز میں اترائیں۔

"ہاں جناب! آپ جیسی چاہنے والی ہو تو بندہ سب کچھ کر گزرتا ہے' کچھ بھی۔۔۔ سوچے سمجھے بنا۔" انہوں نے آخری بات خود کلامی کے انداز میں لمبی سانس بھر کر کہی۔

"کیا کہا زور سے بولیے نا۔" وہ جھنجلائیں۔

"حیا سے بات ہوئی تھی۔" اس نے بات بدل دی۔

"ہاں۔ صبح ہوئی تھی۔"

"پھر اپنے سارے برے خیالات و خدشات نکال کر ڈسٹ بن میں پھینک دیں اور اب سونے کی کوشش کریں۔" انہوں نے۔۔۔ چادر اوڑھتے نصیحت کی۔

وہ خاموشی سے اثبات میں سرہلا کر سونے کے لیے دراز ہوئیں۔

☆ ☆ ☆

صحرا میں بنی اک عالیشان حویلی تھی۔ جس کے لمبے برآمدوں میں پرانی طرز کے فانوس لگے ہوئے تھے۔ اس کے اک شاہی بیڈ روم میں منتظر حسنین سگریٹ پر سگریٹ ہی نہیں سلگا رہا تھا۔ خود بھی سلگ رہا تھا۔ حیا گم صم اسے تک رہی تھی۔

اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا اور آگے کیا ہونے والا تھا۔ تقدیر سے کہاں دھوکا کھاگئی۔ تب اس نے اپنے محبت بھرے دل کو امین بنایا اور میدان فیصلہ میں کود پڑی۔

"منتظر! میں نے تم سے محبت کی ہے' میں تمہارا ساتھ ہر قدم پر نبھاؤں گی۔"

"تم مجھ سے محبت کا ذکر نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔" اک لحظے کو پلٹ کر اسے دیکھا۔ جھنجلاہٹ اس کے ہر فعل سے مترشح تھی۔ وہ پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

حیا دھیرے سے چلتی اس کی پشت پر آگئی۔ حیا کی گہری سانسوں کی گرمی اس کے کانوں کی لوؤں کو چھوتی باہر کی ٹھنڈک میں مدغم ہوگئی۔

"کیا ہمارے بیچ اتنی دوری پڑ چلی ہے کہ محبت از کار رفتہ ہوئی۔" سرسراتی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"تمہارے اس رشتے اور محبت نے مجھ سے میرا عزیز ترین اکلوتا رشتہ اور محسن چھین لیا ہے حیا!" وہ تپتی دھوپ بنا اس کو جھلسانے لگا۔

حیا نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

"ہم محبت کے مرید اپنی فہم و فکر سے سارے الجھے معاملات کو سلجھادیں گے' ساری ناانصافیوں کی تلافی کرلیں گے منتظر! مجھے صرف تمہارا ساتھ درکار ہے۔"

آکھڑی ہوئی۔ "منتظر! صرف تمہاری محبت تمہاری وفا' تمہارا اعتماد چاہیے مجھے۔" اپنا ہاتھ اپنائیت سے اس کے کندھے پر رکھتے وہ ملتجی ہوئی۔

اس نے آگ اگلتی سرخ انگارہ بنی آنکھیں اس پر گاڑیں۔ تپتا ہاتھ اپنے کندھے پر رکھے اس کے ہاتھ پر رکھا زور سے پکڑا اور اٹھا کر اتنی ہی شدت سے جھٹک دیا۔

وہ لڑکھڑا گئی۔

"جنہوں نے نفرت بوئی۔۔۔ جو بے وفائی کے مرتکب ہوئے۔۔۔ جو اعتماد و اعتبار کو پارہ پارہ کرنا جانتے ہوں۔۔۔ جنہیں رشتوں کا کوئی پاس نہیں۔"

وہ غصے سے ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔

"کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ وہ مانگتے ہیں مجھ سے' محبت' وفا اور اعتماد؟" وہ طنزیہ بولتے استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

اس کا وجود اس توہین آمیز رویے پر شعلوں کی زد

کنیز نبوی

ملک حسنین رضا اور حسین رضا دونوں بھائی ہیں۔ حسین رضا پڑھائی کے سلسلے میں شہر میں رہتا ہے اور اس کا بڑا بھائی ملک حسنین رضا گاؤں میں زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

حسین رضا اپنے ماموں کی بیٹی حمیرا کی محبت میں گرفتار ہے اور حمیرا بھی حسین رضا کے جذبات سے آگاہ ہے اور اسے دل وجان سے چاہتی ہے۔

حسین رضا اپنی ماں کی طرف سے گاؤں آنے کے ارجنٹ تار پر سامان سفر باندھ کر گھر جاتا ہے اور گھر پہنچ کر پتا چلتا ہے کہ حمیرا اور حسنین رضا کی شادی کی تاریخ طے پا گئی ہے۔ یہ خبر سن کر حسین رضا کو سخت صدمہ ہوتا ہے۔ حمیرا اور حسنین رضا کی شادی ہونے کے بعد وہ بجھے دل کے ساتھ دوبارہ شہر آجاتا ہے اور تعلیم کی تکمیل کے بعد کاٹن فیکٹری میں منیجر کی جاب کرلیتا ہے۔

شادی کی پہلی رات ہی حمیرا کی طبیعت خراب ہوجاتی ہے اور اسے دورے پڑنے لگتے ہیں جس پر اکثر لوگ جن آسیب کے سائے کی قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ حمیرا کو آئے دن پڑنے والے دورے طویل ہوتے گئے یہاں تک کہ اس کی ساس پوتے کی آس لیے قبر میں جا سوئی جبکہ شوہر حسنین رضا ان دوروں سے تنگ آکر زمینوں پر ڈیرے میں رہنے لگا۔ وہاں منشی کی بیٹی زبیدہ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی۔ بیوی کے پاگل پن سے پریشان حسنین رضا کو جائے پناہ زبیدہ کے وجود میں میسر آئی تو اس نے منشی سے رشتہ مانگ کر سادگی سے نکاح پڑھوالیا۔

ان ہی دنوں حسین رضا زمینوں پر اپنا حصہ وصول کرنے حویلی پہنچتا ہے تو اسے حمیرا کی حالت کا پتا چلتا ہے۔ وہ حمیرا کو

علاج کے لیے لاہور لے آتا ہے۔ ان کے ساتھ ماسی حمیدہ بھی ہوتی ہے۔ حمیرا لاہور آکر بہتر ہو جاتی ہے اور حسین رضا سے شادی کرنے کا کہتی ہے۔ ان دونوں کی باتیں بخشل سن لیتا ہے۔ حسین رضا یہ جان کر ڈر جاتا ہے۔

خنظر حسنین انتہائی غربت کے باوجود اعلا تعلیم حاصل کرتا ہے اور اپنے ماموں اور ماں کے خواب پورے کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اسی کوشش کے دوران خنظر حسنین کو حسین رضا کے دفتر میں جاب مل جاتی ہے۔ حسین رضا کی بیٹی حیا حسین خنظر حسنین کو پہلی نظر میں دیکھ کر ہی اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہ بات حسین رضا کو پتا چل جاتی ہے اور پھر خنظر حسین کو اپنی بیٹی سے شادی کرنے کا کہتا ہے۔ کچھ دن سوچنے کے بعد خنظر حسنین 'حیا حسین سے شادی کے لیے ہاں کر دیتا ہے۔

ماہم اپنی والدہ اور اپنی خالہ کے ساتھ رہتی ہے اور اسے اعلا تعلیم حاصل کرنے اور آگے بڑھنے کا عزم ہمیشہ پرجوش رکھتا ہے۔ ماہم اپنی والدہ کے ساتھ گاؤں آتی ہے تو وہاں اس کی دوستی گاؤں کی ایک لڑکی سے ہو جاتی ہے جو دراصل حیا کی کزن ہوتی ہے۔ وہ ماہم کی جاب کے لیے حیا سے سفارش کرتی ہے اور یوں ماہم کو حیا کی سفارش پر خنظر حسنین کی سیکریٹری کی جاب مل جاتی ہے۔ حیا کے کہنے پر وہ اسے رہنے کے لیے فلیٹ بھی دے دیتا ہے جسے پاکر ماہم اور اس کی والدہ کو بہت خوشی ہوتی ہے۔

۲
دوسری اور آخری قسط

وہ رات کتنی سہانی تھی۔

مومل کے محل جیسی طلسماتی روہی کی رات میں جب معلوم سے نامعلوم کے سفر پر رواں دواں جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہم سفر ستاروں کو گنتی۔ خواجہ فرید کی کافیوں پہ جھومتی تھی۔ اس کے ارد گرد رقصاں ہوا کے جھونکے گالوں سے ٹکرا کر اسے سحر زدہ کر رہے تھے۔ فرید ن پیر کے سرائیکی وسیب کا طلسم اسے جکڑ گیا تھا۔

وہ اپنے سانول یار کے بلاوے پر ملاپ سے بے مدہوش ہوئی جاتی تھی' چولستان کے ٹیلوں کے بیچ ہر جگہ عشق کے جلوے' مٹھن کوٹ کی روہی کو سانول یار جیسے روپ میں ظہور پذیر کرتے' روہی اک ایسے معشوق کی مانند طرح دار ناز و ادا سے بھرپور محبوبہ بنی بیٹھی تھی کہ صرف اس وسیب کے باشندے ہی نہیں' ہر محبت کرنے والا انسان اس روہی ایسی معشوقہ محبوبہ کا عاشق بن بیٹھے۔

اس کا پیر فرید سانول یار روہی وسیب اس کے آگے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اسے کسی نامعلوم سفر پر لے جاتا تھا۔ ساکت و سکون کی فضا' سحر زدہ ماحول پر طاری تھی اور مویشیوں کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کی تال روہی کی فضا کو ایسی موسیقیت عطا کرتی جس موسیقی پہ رائے ڈیاج سر کٹا کر سخاوت کے درجہ اعلا پر فائز ہوا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا' وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے اور کس سفر پر۔۔۔ وہ تو ہجر و فراق کو شکست دے کر وصل و ملاپ کے نکاح میں آچکی تھی۔ اس کے دل میں بہانے پیر پیار لیے اس کے دل کی اجڑی جھوک وس گئی' سانول یار نے گلے کیا لگایا کہ ہفت اقلیم مل گئی۔

وہ شام سلونا یا آج بھی اس کے دل میں مقیم تھا۔ اسی لیے اس کا محل جیسا دل آباد تھا۔

جو جس دا عاشق ہووے اسی دی گل کردا
سو سو مکر بہانے کر دا اسے ہووے مردا

(جو جس سے پیار کرتا ہے' اسی کی بات کرتا ہے۔ سو سو بہانے بنا کے دل کو فریب دے کر۔۔۔ اسی کے غم میں مرتا ہے۔)

وہ فجر پڑھ کر جائے نماز پر غمگین بیٹھی تھی' کئی سالوں بعد اسے نماز پڑھنے کا خیال آیا تھا اور رب سے دعا مانگنے کو دل چاہا تھا۔ اسی دم میٹھی سریلی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

جس دل اندر عشق سماتا' اس نئیں فیر جاتا
بھانویں سوھنے ملن ہزاراں' اساں نئیں یار وٹاتا

(جس دل میں عشق سما جائے' پھر نکلتا نہیں' چاہے کتنے ہی خوب صورت لوگ ملیں' محبوب بدلا نہیں جا سکتا۔)

اس کی آنکھیں یکدم پرنم ہو گئیں۔ وہ آہستگی سے جائے نماز سے اٹھ کر اسے لپیٹنے کو جھکی' آنکھوں سے آنسو جائے نماز پر گر کر اپنی بے بسی کی فریاد کرنے لگے۔ وہ اس دردیلی آواز کے تعاقب میں چلتی ہوئی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔

جنہاں دکھاں وچ دلبر راضی' سکھ رہناں توں وارے
دکھ قبول محمد بخشا' راضی رہن پیارے

(جن دکھوں پر محبوب خوش رہے' میں ان پر خوشیاں قربان کردوں گا' مجھے دکھ قبول ہیں۔ محمد بخش' بس محبوب خوش رہے۔)

اسے وہ سارے دکھ قبول تھے جن سے اس کا ماہی خوش رہ سکتا تھا۔

اس نے تین دن سے خنظر حسنین کو نہیں دیکھا تھا۔ اس کے موبائل وہ پہلے ہی اپنے قبضے میں لے چکا تھا۔ وہ سراپا انتظار' تنہائی کا شکار' کبھی آس کا دامن تھامتی' کبھی نراش ہو کر رونے لگتی۔

کیا ہو گیا تھا اس کے ساتھ اور کیا ہو گا اب اس کے ساتھ۔ حیا حسین جسے وصل جاں افروز سمجھی' وہ ہجر جاں سوز نکلا۔ دل کے دامن تار' تار پر وہ دلاسوں کے پیوند لگاتی۔ حیا حسین اپنا خانہ خراب دل لیے اب بھی اس کے التفات و توجہ کی منتظر تھی۔ کیونکہ اس نے عشق کیا تھا اور دل بیمار کا گر کوئی مسیحا تھا تو وہ خنظر حسنین تھا۔

وہ محبت کے محل سرا میں محبوب کی گلیوں میں گم ہو چکی تھی اور اب ان بھول بھلیوں سے باہر نکلنا ناممکن اور بے کار تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا سوچا ہے آپ نے؟" خنظر نے فون کر کے حسین رضا سے سوال کیا تھا۔

"دیکھو خنظر بیٹا! مانتا ہوں' مجھ سے ماضی میں غلطیاں ہوئیں مگر میری بیٹی۔۔۔ میرے جرم کی سزا اسے نہ دو۔" وہ جو چند دنوں سے کوئی رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے پریشان تھے' رابطہ ہونے پر پہلی بات یہی کی۔

"اس کا یہ قصور کم ہے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے؟"

حسین رضا نے بے بسی سے موبائل کو دیکھا۔

"وہ تمہاری بیوی ہے۔ کوئی غیرت مند شوہر بیوی کو یوں اغوا کر کے اس کے والدین کو بلیک میل نہیں کرتا۔" وہ اپنے تئیں بڑی وزنی دلیل لائے۔

"اور غیرت مند بیوی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" وہ چند لمحے رکا۔ "اور غیرت مند بھائی کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں مسٹر حسین رضا!" وہ ہنوز طنزیہ انداز میں گویا ہوا۔ "جنہوں نے اپنے نفس کی خاطر کسی کی جان لے لی۔" اس کا لہجہ زہر خند ہوا۔

"دیکھو۔۔۔ تم میری بیٹی کو کچھ مت کہنا۔ تم جو کہو گے وہ کروں گا۔ میں حمید اور بخشل کو آزاد کرنے کو تیار ہوں۔"

"او۔۔۔ ہو!" وہ دل کھول کر ہنسا۔ "بڑی جلدی لائن پر آگئے آپ۔"

حسین رضا نے اس کے طنزیہ فقرے کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ "بس تم میری بیٹی کو کچھ مت کہنا۔" وہ گڑگڑائے۔

"ہوں۔۔۔ کب چھوڑ رہے ہیں؟"

"سنو! تم نے میری بیٹی پر تشدد تو نہیں کیا؟" وہ عجلت میں بولے۔

"وہ۔۔۔ کیا آپ نے میرے ماموں پر کیا ہے۔ اگر کیا ہے تو؟" دانستہ اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ بخدا نہیں' حمید پر کوئی تشدد نہیں ہوا۔"

"تو پھر آپ کی بیٹی پر بھی کوئی تشدد نہیں ہوا۔" خنظر کا لہجہ پُراسرار تھا۔ اس کے لفظوں اور لہجے سے کوئی چیز واضح نہیں ہوئی تھی۔

حسین رضا کی آنکھوں میں بے بسی نمی بن کر تیرنے لگی۔

"اک بار میری بیٹی سے بات کروادو۔" ان کے لہجے کی نمی خنظر سے چھپی نہ رہ سکی۔

"صبر۔۔۔ صبر۔۔۔ صبر۔۔۔ کتنا مزا ہے صبر میں' ہے نا حسین رضا!" مستفسرانہ لہجے میں طنز کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

"دیکھو۔۔۔ میں بار بار وعدہ کررہا ہوں۔ تم جو کہو گے وہی ہوگا۔ مگر میرے اطمینان کے لیے میری بیٹی کی آواز سنادو۔" وہ گڑگڑائے۔

"اونہوں۔" اس نے نفی میں ہنکارا بھرا۔ "آپ نے میرے ماموں کی آواز مجھے سنائی' نہیں نا؟"

"میں اس کی آواز سنوانے۔۔۔ بلکہ ابھی اسی وقت چھوڑنے کو تیار ہوں۔ بس تم میری بیٹی کو چھوڑ دو۔"

"ارے!" وہ لہجے میں حیرانی سمو کر بولا۔ "میں بے غیرت تھوڑی ہوں' جو بیوی کو چھوڑ دوں گا۔ یہ تو سوچیے بھی مت حسین رضا!" اس نے دانت کچکچائے۔

حسین نیم مردہ سے صوفے پر ڈھے گئے۔

"تم میری اس سے بات کراؤ۔ اچھا۔۔۔ میں کہاں چھوڑوں بخشل اور حمید کو۔" وہ بے تاب ہوئے۔

"کل صبح دس بجے بادشاہی مسجد میں چھوڑ جائے گا اور کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ یہ آپ کو مہنگی پڑ سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" مردہ آواز اسپیکر سے ابھری تھی۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا۔۔۔ وہ تیرا میاں ہے نا؟" اس بوڑھی عورت نے پوچھا' جو چند دن سے اسے کھانا دینے آرہی تھی۔

"جی اماں!" اس کی آواز بھیگ گئی۔

"کیا کوئی جھگڑا ہوا ہے اس سے؟" وہ نرم لہجے میں استفسار کرنے لگی۔

"میرا تو نہیں۔۔۔ خود ہی ناراض ہو گیا ہے۔"

"بیٹا! میاں' بیوی کا رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ کبھی سانجھ' کبھی سویرا' کبھی دکھ' کبھی سکھ' کبھی دھوپ' کبھی چھاؤں' آپس کی چھوٹی موٹی ناراضیاں تو چلتی رہتی ہیں۔ مگر اک دوسرے کے بغیر گزارا بھی نہیں ہوتا۔ وہ ناراض ہے' تو تم ہی منالو۔" وہ اس بوڑھی عورت کے ناصحانہ انداز پر کتنی ہی دیر چپ رہ گئی۔

"وہ مانے بھی تو نا۔"

"تم مناؤ گی تو مان جائے گا۔ شوہر کہیں جائے یا بھٹکے لوٹ کر گھر ہی آتا ہے۔" وہ اسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔

"اماں! میرا دل تو اس کے عشق کا ایسا آتش کدہ ہے' جو کبھی ٹھنڈا ہی نہیں ہوا۔" وہ آبدیدہ ہوئی۔

"اسے ٹھنڈا ہونے بھی نہیں دینا' ایک نہ ایک دن تم اسے تسخیر کر ہی لوگی۔" وہ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر بولی۔

"بہت مشکل ہے اب مجھے تسخیر کرنا' حیا حسین!" وہ جو اندر کمرے میں اسے لینے آرہا تھا۔ ان کی باتیں سن کر خود کلامی کی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اس کے ساتھ واپس جارہی تھی۔ آتے ہوئے اس کی سنگت میں بے انتہا خوش تھی اور جاتے ہوئے افسردہ۔ وہ اس کا تھا' مگر نہیں تھا۔ وہ اس کے پاس بیٹھا تھا مگر اجنبیت کی دیوار بیچ میں حائل ہو گئی۔ آتے ہوئے جو سفر گھنٹوں کا منٹوں میں طے ہوتا محسوس ہوا۔ وہ جاتے ہوئے صدیوں پر محیط ہو گیا۔

وہ بار بار اسے نظریں چرا کر دیکھتی۔۔۔ مگر اس کے چہرے پر کسی نرمی اور اپنائیت کا شائبہ تک نہ تھا۔

وہ دامن دل کے تار تار وجود کو امید کی سوئی سے محبت کے ٹانکے لگاتی رہی۔

سفر کٹا' مگر بہت تھکا دینے اور روح پر زخم لگانے والا۔ جس میں اس کے محبوب نے اک نظر التفات تو کجا بے التفاتی سے بھی نہیں دیکھا۔

لاہور کے مضافات میں اک گھر میں گاڑی کھڑی ہوگئی۔ وہ اس کی معیت میں اک کمرے میں داخل ہوئی۔ وہاں دو آدمی بیٹھے تھے۔

وہ حمید ماموں کہہ کر ایک آدمی سے لپٹ گیا۔ حمید ماموں اسے گلے لگا کر بے تحاشا رونے لگے۔

"مجھے یقین نہیں آرہا بیٹا! کہ میں تمہیں اپنی زندگی میں پھر دیکھ رہا ہوں۔"

وہ روتے ہوئے ماموں کے ہاتھ چومنے لگا۔

"مجھے معاف کردیں ماموں! میں آپ تک نہ پہنچ سکا اور شاید ساری عمر پہنچ نہ پاتا۔ اگر مجھے آپ کا فون نہ ملتا۔ شاطروں کی تدبیریں ——— تقدیر سے ہار گئیں۔" وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "اب وہ شاطر میرے دام میں ہے' کیونکہ جس طوطی میں اس کی جان ہے' وہ میرے قبضے میں ہے۔" اس کی نظروں کے تعاقب میں حمید ماموں نے اسے دیکھا۔

اس ہتک پر بے ساختہ لب بھینچ کر اس نے سر جھکا لیا۔

"کیا یہ شخص ساری عمر میرے والدین کے کیے کی سزا مجھے دیتا رہے گا۔ میری محبت و چاہت کا احساس کیے بغیر۔" نم آنکھوں میں تفکر کی پرچھائیاں لہرائیں۔

"یہ حسین رضا کی بیٹی ہے کیا؟" بخشل نے اس کی طرف انگلی اٹھائی۔

خنظر حسین نے سر اثبات میں ہلانے پر اکتفا کیا۔ اس وقت حیا کا دل شدت سے چاہا' کاش وہ یہ کہہ دے کہ یہ خنظر حسنین کی شریک حیات ہے۔

☼ ☼ ☼

"یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے حسین رضا! میں نے منع کیا تھا۔ زندگی میں اتنے بڑے رسک نہیں لیتے۔ مگر تم پر تو بھائی کی محبت کا نشہ چڑھا تھا۔ اٹھا کر میری پھولوں جیسی نازک بیٹی کو اس ظالم کے حوالے کردیا۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔۔۔ اسے ملازمت دینے کی غلطی مجھ سے ہوئی مگر بعد میں حیا کی محبت نے مجھے مجبور کردیا تھا اور وہ میرا بھتیجا ہے۔ یہ پتا تو بعد میں چلا تھا۔"

"جب پتا چلا تو رشتہ کیوں دیا۔"

"تب تک حیا بہت آگے جا چکی تھی۔ ہم اس کی شادی نہ کراتے تو وہ خود کرلیتی۔" حسین رضا بے چینی سے ٹہلتے بولے۔

"میں ماں تھی اس کی' کبھی بھی اسے یہ شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔"

"ہاں۔۔۔ تم ماں تھیں اس کی' اسی بات نے مجھے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا۔ اگر تم کچھ بھی کرسکتی ہو تو وہ بھی تمہاری ہی بیٹی تھی نا۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تلخی سے بولے۔

وہ چند لمحے سن سی بیٹھی رہ گئیں۔ آج یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ ان کا محبوب' ان کا شوہر' ان کی محبت کی شدتوں کو طعنہ بنا کر ان کے منہ پر مارے گا۔

"کیوں خاموش ہو گئیں' بری لگی ہے نا میری بات پر حقیقت یہی ہے حمیرا۔۔۔ حقیقت یہی ہے۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولے۔ "ہم جو بازی جیت کر سرشار بیٹھے تھے۔ آج جب جذبے سرد اور شدتیں ماند پڑی ہیں تو پتا چلا' ہم تو بازی ہار گئے ہیں۔" ان کے لہجے میں دکھ' تاسف گئے زمانوں کا پچھتاوا۔۔۔ کیا کچھ نہیں تھا۔

"ہم اپنی سب سے قیمتی متاع ہار بیٹھے ہیں اور اب ہمیں سر اٹھا کر نہیں جھکا کر جینا ہے۔" وہ آبدیدہ ہوئے۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔" وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑائیں۔

"ہاں ایسا ہو گیا ہے' کیونکہ سب سے بڑا منصف اوپر بیٹھا ہے۔ تب ہی ہم اتنے دنوں سے تڑپ رہے ہیں اور اب تو حمید اور بخشل کو چھوڑتے ہوئے بھی وہ

دن ہوگئے۔ مگر کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ پتا نہیں ہماری بیٹی زندہ بھی ہے یا۔"

"نہیں۔ خدا کے لیے ایسا نہیں کہو۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخیں۔

حسین رضا پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

☼ ☼ ☼

"میں حمیرا کے کہنے پر دودھ لینے گیا۔ واپس آیا تو جو میرے کانوں نے سنا اس پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"میں دروازے پر کھڑا ہوگیا۔ دوسرے کمرے میں تمہاری ماں خوشی خوشی جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ حسنین رضا کی جدائی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ اس سازش سے بے خبر، مگن تھی۔

حسین رضا، حسنین رضا کے آگے قسمیں کھا کر میرے اور زبیدہ کے بیچ ناجائز تعلق کا یقین دلا رہے تھے۔

میں سمجھ گیا کہ میں ان کے اور حمیرا کے ناجائز و گھٹیا تعلق سے باخبر ہوگیا ہوں۔ اس لیے وہ الٹا مجھ پر اور فرشتہ صفت زبیدہ بھابھی پر الزام لگا رہے ہیں۔ مبادا میں ان کے تعلق کے بارے میں حسنین رضا کو نہ بتا دوں۔"

یہ حقیقت جو ان سب پر منکشف ہو رہی تھی۔ حیا کے لیے سوہان روح تھی۔ اسے تو آج تک پتا نہ چلا تھا کہ اس کی ماں اس کے باپ سے شادی سے پہلے اس کے تایا کی بیوی رہ چکی تھی۔ اسے تو ہمیشہ یہی بتایا گیا کہ حسین رضا اکلوتے تھے۔ گاؤں بھی اس کا جانا ہی نہیں ہوا تھا۔

"منتظر میاں! میں کبھی بھی ان کے تعلق کے بارے میں بتا نہ پاتا، کیونکہ ہم کمی کمین لوگ تھے۔ بڑے لوگوں کے عیب دیکھ بھی لیں، تب بھی انجان بن کر رہتے ہیں۔ ورنہ ہماری آنکھیں نکال دی جاتی ہیں اور زبانیں کاٹ دی جاتی ہیں یا موت کی نیند سلایا جاتا ہے۔"

بخشل اپنی داڑھی میں ہاتھ پھیر کر افسردگی سے بولا۔

حیا پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کی ماں بدکردار تھی۔ کاش یہ سننے سے پہلے وہ مرجاتی کاش کوئی فرشتہ گواہی کر آتا اور ببانگ دہل کہتا ان پر یہ الزام سراسر جھوٹ ہے۔

"میں الٹے پاؤں بھاگا۔ اس وقت رک جاتا تو زندہ نہ بچتا۔ سیدھا اپنی سالی کے پاس گیا اور کہا کسی طرح سے میری بیوی کو گاؤں سے لے آئے۔ پھر عمر بھر واپس نہیں گیا۔ ایک اسپتال میں صفائی کے کام پر لگ گیا۔ دال روٹی اچھی چل رہی تھی۔"

"اماں کے ساتھ کیا ہوا تھا پھر؟" منتظر بے چین ہوا تھا۔ تب ہی حمید ماموں بول اٹھے۔

"ملک جی نے اسی وقت اسے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ وہ انجان اتنے بڑے الزام سے روتی لرزتی گھر پہنچی۔ میں اسی وقت اسے لے کر وہاں سے نکل گیا۔ ملکوں کا کوئی بھروسا نہ تھا کہ وہ کب قتل کرادیں۔ آخر ان کی عزت پر بن آئی تھی۔" حمید ماموں کی آواز بھرا گئی۔

"شہر میں مختلف مزدوریاں کرتے وقت کاٹا، وہیں تمہاری پیدائش ہوئی۔ ساری عمر ہم ملکوں سے چھپتے رہے۔ کبھی کہیں، کبھی کہیں، مگر ان کے ہتھے چڑھ ہی گئے۔" حمید افسردہ ہوگئے۔

حیا کا دل چاہ رہا تھا زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس کے پاس صوفے پر بیٹھا منتظر اس کو نفرت سے دیکھ رہا تھا۔

"پھر۔ پھر اس کے بعد بابا کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"ٹھیک آٹھ ماہ بعد میں نے اسی اسپتال کے ایک کمرے میں حسنین رضا کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹے تھے یا غنودگی میں تھے۔ حسین رضا ان کے پاس بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں نے ڈسٹ بن اٹھایا اور فوراً باہر نکل آیا۔ حسین رضا نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اخبار پڑھنے میں مصروف رہے۔

میں نے شکر ادا کیا کہ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ اس دن کے بعد میں اس کمرے کی صفائی کے لیے اپنے ساتھ کام کرنے والے دوسرے آدمی کو بھیجتا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ حسین رضا کے آتے ہی فوراً ایک جونیئر ڈاکٹر لپک کر ان کے پیچھے جاتا تھا۔ شک تو مجھے پہلے ہی تھا۔ میں نے کھوج لگائی۔ جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ وہاں کیا ہو رہا تھا۔ حسنین رضا کو سلو پوائزن دیا جارہا تھا۔ یہ لوگ ہمیں جاہل سمجھتے ہیں۔ اس لیے ہمارے سامنے زیادہ احتیاط نہیں برتتے۔ میں چونکہ ان کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس لیے میرے کانوں میں کچھ باتیں پڑ گئی تھیں۔ ایک دن جب ڈاکٹر نے انہیں انجکشن دیا۔ ان کی حالت بہت بگڑ گئی میں بڑے ڈاکٹر صاحب کو بلا لایا۔ انہوں نے کہا کہ ان کو کوئی غلط انجکشن دیا گیا ہے۔ انہوں نے فوراً ایکشن لیا۔ وہ ڈاکٹر جس نے یہ انجکشن لگایا تھا وہ پکڑا گیا۔ حسین رضا نے دے دلا کر معاملہ ٹھنڈا کروا دیا اور حسنین رضا کو وہاں سے لے گئے۔ مگر جلد ہی پتا چلا کہ ان کی موت واقع ہوگئی ہے۔ بس پھر ایک دن مجھے اٹھا لیا گیا اور پھر ساری عمر قید میں ہی گزر گئی۔ منتظر میاں۔ میں ہر دن منتظر ہی رہا کہ کب میری موت کے احکامات جاری ہوں گے۔ مگر شاید تقدیر بنانے والے نے مجھے زندہ رکھنا تھا یہ حقیقت آپ تک پہنچانے کے لیے۔ تب ہی زندہ بیٹھا ہوں۔"

☼ ☼ ☼

اجنبیت کی سنگی دیوار ان کے بیچ حائل تھی۔ وہ بھی خود میں ہمت نہ پاتی اس کو مخاطب کرنے کی۔ اس وقت بھی سر جھکائے اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا چپ چاپ بیڈ پر نیم دراز رہا۔ پھر ایک دم اپنا موبائل اٹھایا۔

"ہاں مسٹر حسین رضا!"

حیا نے چونک کر دیکھا۔

"بیٹا! ابھی تک پہنچے کیوں نہیں؟" حسین رضا کا لہجہ اپنائیت بھرا تھا۔

وہ طنزیہ ہنسا "اس لیے کہ کیا گارنٹی ہے میرے پاس کہ واپسی پر آپ مجھے قتل نہیں کرا دیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔" وہ بے چین ہو کر بے ساختہ بول اٹھے۔ منتظر حسنین نے دزدیدہ نظروں سے اسے گھورا۔

"بیٹا! کیا کہہ رہے ہو؛ تم میرے داماد ہو۔ میری بیٹی کا سہاگ۔"

"آپ جو اپنے سگے بھائی کو قتل کرکے اس کا زر، زمین اور زن ہتھیا سکتے ہیں تو داماد کا کیوں نہیں؟" وہ سختی سے گویا ہوا۔

"تم جو گارنٹی چاہو، میں دے سکتا ہوں۔" وہ نزع کے عالم میں بولے۔

"ٹھیک ہے۔ پھر میرے وکیل سے بات کرلیں، جو کہے وہ مان لیجیے گا۔"

"کہ کیا۔ کیا بات؟" ان کے پسینے چھوٹ گئے۔

"یہ کہ اگر منتظر حسنین کسی بھی طرح کی حادثاتی موت کا شکار ہوا تو اس کے ذمہ دار مسٹر حسین رضا ہوں گے۔ کیونکہ منتظر حسنین کو صرف شبہ ہی نہیں، یقین ہے کہ وہ اسے قتل کرا سکتے ہیں اور اگر موت طبعی ہو تو بھی مکمل پوسٹ مارٹم کیا جائے کہ کہیں اسے سلو پوائزن تو نہیں دیا گیا۔"

"میں تیار ہوں۔" انہوں نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے کہا۔

"ٹھیک ہے میرا وکیل آپ کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اسے اندر بلا لیں۔"

اس وقت حسین رضا کو لگا جیسے وہ اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر رہے ہیں۔ مگر اپنی جان سے عزیز تر بیٹی کو بچانے کی خاطر وہ سب کچھ کرسکتے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ صالحہ خاتون کی گود میں سر رکھے سر میں مالش کروا رہی تھی۔ جب اک نیا نمبر اسکرین پر دیکھ کر اس نے سیل فون واپس رکھ دیا اور پھر سے آنکھیں موند کر خالہ سے لاڈ اٹھوانے لگی۔ جب پانچویں بار کال آئی تو وہ جھنجلا اٹھی۔

"پتا نہیں کون ڈھیٹ ہے، تھکتا ہی نہیں۔"

"ارے بیٹا! اٹھالے کیا پتا کسی کو ضروری کام ہو۔"
اس نے فون اٹھایا۔
"مس ماہم! میں منتظر بول رہا ہوں۔"
"سر آپ!" وہ حیرت سے گویا ہوئی۔
"مس ماہم! وہ مہمان ہیں۔ میرے لیے بہت خاص' بے حد اہم' جب تک میں ان کے رہنے کا انتظام کروں' آپ ان کو چند دن اپنے فلیٹ میں رکھ سکتی ہیں؟"
"سر! یہ میرا فلیٹ کہاں ہے' آپ کا ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
"میں کوشش کروں گا کہ آپ کو زیادہ دن تکلیف نہ ہو۔"
"پلیز سر۔۔۔ میری ذات پر آپ کے جو احسان ہیں وہ عمر بھر نہیں اتار سکتی۔"
"ٹھیک ہے۔ ہم کل صبح آرہے ہیں۔ آپ چاہیں تو کل چھٹی کر سکتی ہیں۔"
"نہیں سر! اس کی ضرورت نہیں' گھر میں میری ماں اور خالہ ان کی مہمان داری کے لیے موجود ہوں گی۔"
"او کے۔۔۔ اللہ حافظ۔"
"حیرت ہے خالہ! سر اپنے مہمانوں کو کسی ہوٹل میں بھی ٹھہرا سکتے ہیں۔ وہ یہاں کیوں بھیج رہے ہیں۔"
"ارے بیٹا! ہوگی کوئی مصلحت۔۔۔ اتنا بڑا فلیٹ ہے۔" ماں نے ٹوکا۔
خورشید اٹھ گئی۔ ان مہمانوں کی آمد کی تیاری بھی کرنی تھی۔

✡ ✡ ✡

اس نے ٹیکسی والے کو پتا سمجھا کر ماموں اور بخشل کو بھیجا۔ خود اس کی گاڑی میں آبیٹھا۔
"پہلے آفس چلو۔" حیا نے اس کے تحکمانہ لہجے پر ایک لحظے کو اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
کیا منتظر حسنین کے نرم لہجے کے لیے میں اب ترستی ہی رہوں گی۔ اس کا دل بھر آیا۔
"آ۔۔۔ آپ گھر نہیں چلیں گے؟"
سر اٹھاتے خدشوں کو بے حد مشکل سے ہمت مجتمع کرتے زبان دی۔
"ابھی نہیں' شام کو آجاؤں گا۔" وہ اس کے لہجے میں اپنائیت کو تلاشتی رہ گئی۔ مگر کوئی شائبہ تک نہ ملا۔ اس کے لیے نہ شہر اجنبی تھا' نہ ہی ساتھ بیٹھا شخص مگر اجنبیت کے لمبے سائے اس کی زندگی پر محیط ہو رہے تھے۔
اس لمحے وہ خود کو بے حد تنہا محسوس کر رہی تھی۔ وہ انسان تھی' خدا نہیں اور انسان دنیا میں تنہا آتا ہے۔ تنہا جاتا ہے' مگر دنیا میں تنہا نہیں جی پاتا۔
گھر پہنچی تو اس کے ماں' باپ صدیوں کی پیاس لیے اس کی طرف بڑھے۔ مگر وہ ہر سوچ و احساس سے عاری تھی۔ ان کی کسی گرم جوشی کا جواب نہیں دے پا رہی تھی۔
"اللہ کا شکر ہے۔ میری بیٹی گھر واپس آگئی ہے۔" حسین رضا آبدیدہ ہوئے۔
"ہاں۔۔۔ مالک نے بڑا کرم کیا۔ احسان ہے خدا کا کہ آج زندہ سلامت اپنے جگر گوشے کو دیکھنا نصیب ہوا۔" حمیرا اس کا منہ چومتے بولیں۔
"آپ ٹھیک تو ہیں نا بیٹا! منتظر نے کوئی برا سلوک تو روا نہیں رکھا۔" حسین رضا بغور بیٹی کو دیکھتے ہوئے بولے مگر حیا کی شکایتی نظروں سے گھبرا کر رخ پھیرا اور بے چین ہو کر صوفے پر بیٹھ گئے۔
"اس گندی عورت کے بیٹے نے میری پھولوں جیسی بیٹی کی زندگی زہر کر دی نا حسین رضا؟" حمیرا نے غصے سے شوہر کو مخاطب کیا۔
حیا نے اک نظر سر جھکائے باپ کو دیکھا۔ جن کے چہرے پر شرمندگی غلطیوں کا پچھتاوا بن کر نمایاں تھی۔ پھر ماں کو دیکھا' جو بالکل پہلے کی طرح تھیں۔ ان کے چہرے پر کوئی شرمندگی اور پچھتاوا نہ پا کر اس کے اندر بھرا غصہ ابھر کر باہر آیا۔
"زندگی زہر تو آپ لوگوں نے میری کی ہے۔ آپ

کے گناہوں کا کفارہ اب ساری عمر مجھے ادا کرنا پڑے گا۔"
وہ کہتے ہوئے لاؤنج میں رکی نہیں۔ اپنے کمرے میں آگئی۔ جہاں ہر سو وحشت اور تنہائی بچھی ہوئی تھی۔
"زندگی میں یہ دن بھی دیکھنا تھا۔" حسین رضا نے ندامت و افسوس سے خود کلامی کی۔

✡ ✡ ✡

"سر! یہ فائلیں آپ کے دستخط کی منتظر ہیں۔" ماہم نے فائلوں کا ڈھیر اس کی میز پر رکھا۔
"ارے مس ماہم! آپ میرے منع کرنے کے باوجود آفس آگئیں۔" منتظر نے چونک کر اسے دیکھا۔
"سر! مجھے پتا تھا کہ آپ آفس کے معاملات کو ہر چیز پر فوقیت دیتے ہیں۔"
وہ چند لمحے خاموشی سے فائلوں پر دستخط کرتا رہا' پھر بولا۔
"یہ فائلیں چھوڑ جائیں۔ میں ان کو دیکھ کر پھر سائن کروں گا اور یہ لے جائیں۔" اس نے دستخط شدہ فائلیں اس کی طرف بڑھا کر کہا۔
"جی بہتر سر!" وہ فائلیں اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی۔
اس نے نظریں اٹھائیں تو ماہم کی پشت پر لہراتی لمبے بالوں کی چٹیا دیکھتے اسے اپنی ماں کے لمبے بال یاد آگئے۔ پہلے کالے' پھر سفید و کالے اور پھر سرخ بال مہندی سے رنگے۔
وہ برآمدے میں لکڑی کے تخت پر بیٹھی سلائی کرتی ماں کی پشت کی طرف لیٹ کر اس کی چٹیا سے کھیلتا رہتا۔ جو تخت پر گری رہتی۔ وہ تھوڑی دیر بعد اپنی چٹیا سے کھیلتے بیٹے کو سر گھما کر ترچھی آنکھوں سے دیکھتی۔
"بے نا ملکوں کا خون' گھوڑے پر سواری کرنے والوں کا بیٹا۔ اب گھوڑے کی لگام نہیں' ماں کی چٹیا ہی سہی۔"
وہ ہنس کر کہتی۔
اس نے بہت آہستگی و نرمی سے اس دلکش یاد کو دل کے کونے میں بحفاظت رکھا۔
وہ بخشل سے اس کی بیٹی اور بیوی کو ڈھونڈنے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اسے لے کر سیالکوٹ جانا تھا۔ جہاں اس کی سالی رہتی تھی۔
آفس میں کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اسے حیا یاد آئی۔ جو اسے فون کر کے لنچ پر گھر آنے کی یاد دہانی کراتی تھی۔
"حیا حسین!" اس نے غصے سے لب بھینچے۔
دشمن کی بیٹی جو اس سے محبت کرتی تھی۔ اس کے باپ کے قاتلوں کی اولاد۔۔۔ سر جھٹک کر اپنا سیل فون اور گاڑی کی چابی اٹھائی' باہر نکل آیا۔
"مس ماہم!"
"جی سر!" وہ مستعدی سے اٹھی۔
"آپ چل رہی ہیں۔ میں آپ ہی کے گھر جا رہا ہوں۔"
"جی ضرور سر!" وہ کھل اٹھی۔
"مجھے اپنے مہمانوں سے ملنا ہے۔" اس نے وضاحت دی۔
"میں جانتی ہوں سر۔۔۔ ورنہ ہمارے ایسے نصیب کہاں کہ آپ ہمارے گھر تشریف لائیں۔"
اس نے مسکرا کر پتا اچھالا۔ وہ فوراً "دام" میں آیا۔
"ارے نہیں۔۔۔ نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ آپ بلائیں تو میں ضرور آتا۔" اس نے رسماً کہا۔
"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے اس قابل جانا۔" وہ گاڑی ڈرائیو کر کے مین روڈ پر لے آیا۔ وہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتی رہی۔
"کاش! یہ بندہ ہمیشہ کے لیے میرا ہو جائے۔" اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔

✡ ✡ ✡

وہ کمرا بند کیے بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ جیسے

جیسے لنچ ٹائم قریب آرہا تھا۔ اس کی بے چینی میں اضافہ ہو تا رہا۔

وہ کتنی خوش اور مسرور تھی۔

وہ اس کو فون کرکے گھر آنے کو کہتی۔ وہ شوق سے پوچھتا۔

"آج میرے لیے کیا بنایا ہے۔"

وہ اس کی پسند کی کوئی نہ کوئی چیز بنا کر بیٹھی ہوتی، کبھی نام بتاتی، کبھی کہتی "سرپرائز ہے۔ خود آکر دیکھنا" کھانا پھر تعریف کرنا۔"

وہ ہنس کر کہتا۔ "آتا ہوں۔"

ایک گھنٹہ اس کے ساتھ گزار کر وہ پھر واپس آفس چلا جاتا۔

شام کو آنے کے بعد وہ گھومنے نکل جاتے۔ ڈنر کبھی باہر کسی ہوٹل میں کرتے یا بار بی کیو چلے جاتے مگر آج..... ان کی جدائی کا آغاز ہونے جارہا تھا۔

"نہیں..... وہ میری زندگی ہے۔ میں اسے خود سے الگ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ میرے دل میں دھڑکن بن کر دھڑکتا ہے۔ اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔"

وہ ہذیانی ہوئی، اس کا نمبر ملاتی رہی۔ آفس کا نمبر، سیل فون، ہر جگہ سے جواب ندارد۔

وہ میسج کرتی رہی۔

"میں کھانے پر منتظر کی منتظر ہوں۔"

"میں تمہارے بغیر کھانا نہیں کھا سکتی۔ پلیز منتظر! گھر آؤ۔"

"تمہیں پتا ہے میں تم سے شدید محبت کرتی ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

کتنے ہی میسج کر ڈالے کوئی جواب نہ تھا۔ پتا نہیں وہ پڑھنے کی زحمت بھی گوارا کرتا ہے یا نہیں۔

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں

اس نے تھک ہار کر آخری پیغام بھیجا۔ آنسو اس کے رخساروں کو بھگوتے رہے۔

دروازے پہ ملازمہ کھڑی تھی۔ وہ تیسری بار اسے لنچ کے لیے بلانے آئی تھی۔

"حیا بی بی! آپ کو بیگم صاحب....."

"دفع ہو جاؤ۔ نہیں کرنا لنچ، جاکر بتادو میری زندگی برباد کرنے والوں کو۔"

ڈائننگ ہال تک اس کی آواز کی گونج گئی تھی۔ حسین رضا اور حمیرا کے گلے میں نوالے اٹک گئے کھانا ان کے لیے بھی زہر ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کا فون بج رہا تھا۔ مسلسل پیغامات آرہے تھے اسے پتا تھا کہ حیا حسین اس کی منتظر ہے۔ حیا اس سے لاکھ محبت کی دعوے دار سہی، مگر تھی تو اس کے باپ کے قاتلوں کی اولاد..... اس کی محبت اس احساس کے سامنے بہت ہلکی پڑ جاتی۔ وہ اس کے بلاووں کو نظرانداز کرکے ماہم کے ساتھ اس کے فلیٹ پر آیا تھا۔

اندر کے منظر نے ان دونوں کو حیران کر دیا۔ بخشل اور حمیدا ان کے گھر میں ایسے گھل مل کے بیٹھے تھے، جیسے ہمیشہ سے رہ رہے ہوں۔

"بیٹا! تو زبان کا دھنی نکلا، وعدہ کرتے ہی مجھے میری بیوی کے پاس پہنچا دیا۔" بخشل نے اٹھ کر اس کا ماتھا چوما۔

"میں سمجھا نہیں۔" وہ حیرانی سے بولا۔

"یہ..... یہ ہے نا میری بیٹی!" بخشل صدیوں کی پیاسی شفقت لیے ماہم کی طرف بڑھا۔ وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹی۔

"ارے پاگل! یہ تیرا باپ ہے۔" اس کی ماں نے بازو سے پکڑ کر اسے بخشل کے قریب کیا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔

وہ اس عجیب ملنگ سے حلیے والے آدمی کو فوری طور پر باپ کے روپ میں قبول نہ کر پا رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اس کا سر پکڑ کر ماتھا چوم رہا تھا۔ آنکھیں پونچھ رہا تھا۔

"کتنی بڑی ہو گئی ہے میری بیٹی۔" خوشی بخشل کے لہجے سے عیاں تھی۔

"ارے بخشل! یہ تیری بیٹی تو لگتی ہی نہیں، ملکانی

لگ رہی ہے 'ملکانی۔'' معید نے خوشی سے قہقہہ لگایا۔ ماہم نروس ہو گئی۔ مگر اک خواہش جو اندر کہیں چھپی ہوئی تھی۔ فوراً'' سر اٹھانے لگی۔ اس نے بے اختیار منتظر حسنین کو دیکھا۔ جو اس دلچسپ منظر و مکالمے سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''سر آپ پلیز بیٹھیے' میں کولڈ ڈرنک لاتی ہوں۔'' اس ماحول سے بھاگنے اور خود کو سنبھالنے کے لیے فوراً'' بہانہ مل گیا۔

وہ ڈرائنگ روم کے صوفے پر ماموں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ سر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا تھا کہ بخشل کی بیوی بیٹی مل گئیں مگر ساتھ ہی اس احساس نے رنجیدہ کر دیا کہ اک باپ اپنی بیٹی کے لیے سالوں تک ترستا تڑپتا رہا تھا۔ حمیرا اور حسین رضا سے شدید نفرت کا احساس گہرا ہوا۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

رات گئے جب وہ گھر پہنچا تو حسین رضا اور حیا کو جاگتے پایا۔

''منتظر! کہاں رہ گئے تھے تم؟ کتنی دیر سے ہم انتظار کر رہے تھے۔'' حیا کا لہجہ نم ہوا۔ حسین رضا لاؤنج کے صوفے سے اٹھے۔

''ہاں بیٹا! میں بھی صبح سے آپ کا منتظر ہوں۔''

''کیوں؟'' آنکھوں میں دیکھتے تلخی سے بولا۔

''مجرم ہوں تمہارا۔ معافی مانگنی تھی۔''

''معافی اس بات کی مانگی جاتی ہے' جس کی تلافی ممکن ہو۔'' وہ چبا چبا کر گویا ہوا۔ دو قدم آگے چل کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''لا سکتے ہیں وہ پدرانہ شفقت جو مجھ سے چھین لی۔ کر سکتے ہیں میری ان محرومیوں کا ازالہ جو میری ماں رات دن سلائی کرتی' پھر بھی میری چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر رہی۔''

حیا نے آزردگی سے لب بھینچ کر آنکھیں موندیں۔

''بیٹا! جس کی تلافی ممکن ہو کرلینی چاہیے۔ تم اپنے ماموں کو اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو۔ میں بخشل کو بھی بھاری تاوان دینے کو تیار ہوں۔ مانتا ہوں میں غلطی پر تھا۔ مگر مجھے تم سے محبت ہے بیٹا! تم ہمارے ملکوں کے خاندان کے اکلوتے وارث ہو۔'' وہ آبدیدہ ہوئے۔

''محبت؟'' وہ لفظ چباتے سوالیہ انداز میں گویا ہوا۔ ''محبت تو خود کو اور دوسروں کو جینے کا حوصلہ فراہم کرتی ہے۔ خوشی دے کر تحفظ فراہم کرتی ہے' مگر یہ کیسی محبت ہے مسٹر حسین رضا۔ کہ میں خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگا ہوں۔ ہر وقت اپنی موت کا خدشہ اور آپ کی سازش کا اندیشہ رہتا ہے۔''

''اگر میں تم سے محبت نہ کرتا تو تمہیں اپنا داماد کیوں بناتا۔ اپنی جان سے پیاری بیٹی تمہارے حوالے کیوں کرتا۔'' وہ نرم لہجے میں ملتجی ہوئے۔

''خود غرض' لالچی اور حاسد لوگ محبت جیسے نرم و ملائم جذبے سے واقف ہوں یہ ممکن ہی نہیں۔ اس کے پیچھے بھی کوئی چال ہوگی۔''

''یقین کرو بیٹا! میں تمہاری اور حیا کی خوشیوں کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔''

''او سب کچھ! ویسے ہی نا جیسے اپنی اور حمیرا کی خوشیوں کے لیے کیا۔'' وہ استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔

حسین رضا نے گہری سانس لے کر اپنی شرٹ کا گریبان والا بٹن کھولا۔ ان کا دم گھٹ رہا تھا۔ ان کی بیٹی سر جھکا کر بوجھل قدموں سے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ چند لمحوں تک اسے بیڈ پر جوتوں سمیت نیم دراز دیکھتی رہی۔ پھر دل مضبوط کرکے آ کر اس کے جوتے اتارے۔

وہ فوراً'' اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''تم کیا سمجھتی ہو' مشرقی بیویوں کی طرح یہ خدمت کے ڈرامے کر کے مجھے جیت لوگی؟''

اس نے اس کی طنزیہ مسکراہٹ کو نظر انداز کر دیا۔

''نہیں۔ محبت سے۔''

''محبت ہونہہ۔ تمہاری محبت اب میری نفرت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔'' اس کے ہتک آمیز رویے نے دل کو تڑپا دیا۔

''مجھے تم سے محبت ہے منتظر! مانا کہ تم رشتوں پر اعتماد کھو چکے ہو مگر دلاؤں گی' تم کو رشتوں پر یقین۔'' وہ اس کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''تم مجھے کوئی یقین نہیں دلا سکتیں۔ کھو چکی ہو تم میرا اعتبار' اعتماد اور محبت۔'' دونوں ہاتھ جھٹک کر ہٹا دیے۔

اس کے لہجے کی انی دل میں پیوست ہوئی۔ وہ بیڈ کے کونے پر ڈھے سی گئی۔

☼ ☼ ☼

ساری رات کی بے چینی کے بعد اس نے اپنے دل کے ٹکڑے جوڑے ریزہ ریزہ وجود کو مجتمع کیا اور بڑی لگن سے ناشتے کی تیاری میں مگن ہو گئی۔ اپنی نگرانی میں ناشتا بنوا کر ٹیبل پر لگوایا۔ پھر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔

منتظر اٹھا تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔ ساری رات اسے بے چینی میں نیند نہیں آئی تھی۔ ایسا لگتا کہ جیسے حسین رضا اس کو قتل کرنے آ رہے ہیں۔ وہ چونک چونک کر اٹھتا' آنکھیں کھول کر دیکھتا۔ صبح کے قریب اسے گہری نیند آئی تھی۔ جاگا تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو کر باہر آیا تو ڈائننگ ٹیبل پر انہیں اپنا منتظر پایا۔

''آجاؤ منتظر! ناشتہ کب سے تیار ہے۔'' حیا نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

وہ آہستہ روی سے چل کر ڈائننگ ٹیبل تک آیا۔ حیا کے پہلو میں بیٹھنے سے گریز کرتے عین سامنے والی کرسی ہٹائی۔ دونوں ہتھیلیاں ٹیبل پر جمائیں حیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھانکا۔

''ناشتے میں زہر ملا کر انتظار کر رہی ہو۔ ہے نا؟''

طنزیہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی۔ حیا تاسف سے اسے دیکھ کر لب کاٹنے لگی۔

''مارنا چاہتی ہو؟''

''میں تو خود محبت کے ہاتھوں مر گئی ہوں۔'' اس کی آواز نم ہو گئی۔

حسین رضا کے چہرے پر دکھ امڈ آیا۔

حیا ٹیبل کی دوسری طرف سے گھوم کر اس کے پاس آئی۔

''میری رگوں میں تمہاری محبت دوڑتی ہے منتظر!''

''اور میری رگوں میں تمہاری نفرت۔ گھن آتی ہے مجھے تم سے' تمہاری محبت سے۔'' بھنویں اچکاتے حیا کو گھورا' جو اس کے سامنے ایستادہ تھی۔

''اور تمہاری رگوں میں دوڑنے والے اس خون سے' جو تمہاری قاتل ماں کے ناپاک بطن سے تم میں منتقل ہوا۔''

حمیرا غصے میں کھڑی ہو گئیں۔ حسین رضا نے فوراً'' ہاتھ کے اشارے سے انہیں کچھ بھی بولنے سے منع کیا۔ حمیرا کو دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔

''تم۔ تم قاتل کی بیٹی ہو۔ مجھے بھی قتل کرنا چاہتی ہو' اپنی ماں کی طرح۔''

حیا کے آنسو اس کے گالوں پر رواں ہو گئے۔ وہ صرف دکھ سے نفی میں سر ہلاتی رہی۔

''مگر میں تمہیں یہ موقع کبھی فراہم نہیں کروں گا۔ میں۔ منتظر ہوں۔'' اس نے اپنے سینے پر دائیں ہاتھ کی شہادت انگلی رکھی۔ ''حسنین رضا نہیں کہ بے خبری میں مارا جاؤں۔'' وہ نفرت سے کہتا باہر نکلا۔

''اس۔ اس کی اوقات کیا ہے' جو یوں ہمیں بے عزت کر رہا ہے۔'' پیچھے سے حمیرا کی دھاڑ سنائی دی۔

''اس کی اوقات یہ ہے کہ وہ تمہاری بیٹی کا شوہر ہے۔''

حسین رضا نے حمیرا کو جواب دیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مسکرایا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☼ ☼ ☼

آفس میں اس کا دل آج بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے ناشتا بھی نہیں منگوایا۔ وہ کبھی ٹہلتا' کبھی کرسی پر جھولتا رہا۔ اس کے اندر جیسے آگ بھری تھی۔ جو اسے جلا رہی تھی۔ بے سکون کر رہی تھی۔ وہ فرار چاہتا تھا۔ ان حالات اور اپنی حالیہ زندگی سے۔

"السلام علیکم سر!"

اس نے سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑی ماہم کو دیکھا۔

"کیسی ہیں مس ماہم؟" چاہنے کے باوجود وہ مسکرا نہ سکا۔

"بالکل ٹھیک سر! مگر لگتا ہے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"آپ کا ساتھ رہا تو میری طبیعت بھی ٹھیک ہو جائے گی۔" وہ بے ساختہ کہہ گیا۔

"جی سر!" وہ ٹھٹک گئی۔

"آپ کیسی میزبان ہیں؟" اس نے بے وجہ بات بڑھائی۔

"یہ تو آپ اپنے ماموں سے پوچھیں؟" وہ کھلکھلائی۔

"وہ تو بہت خوش ہیں آپ کی میزبانی سے' تھوڑی دیر پہلے ہی بات ہوئی ہے فون پر۔"

"پھر تو میں اچھی میزبان ہوئی نا سر!" وہ خوش ہوئی۔

اس کی بات پر وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

کسی حد تک وہ ذہنی دباؤ سے باہر آیا۔

"چلیں تو پھر ناشتا منگوائیں' آج ناشتا کر کے نہیں آیا۔ اصل میں آنکھ ہی دیر سے کھلی۔ اس وجہ سے۔" اس نے خوانخواہ وضاحت دی۔

☼ ☼ ☼

"ماموں! گھر جانے کو دل نہیں کرتا۔ بحالت مجبوری جاتا ہوں۔" وہ حمید ماموں کے پاس بیٹھا تھا۔

"وہ تم سے محبت کرتی ہے؟" حمید نے ڈرائنگ روم میں اپنے ساتھ صوفے پر بیٹھے منتظر کو جانچتی نظروں سے دیکھا۔

"دعوے تو بہت بڑے بڑے کرتی ہے۔" اس نے بھنویں اچکائیں۔

"دعوے تو کرے گی نا بیٹا جانی! تاکہ تم بے وقوف بنے رہو اور وہ اپنی ماں کی طرح تمہارا کام تمام کر دے۔" وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے نفرت سے بولے۔

منتظر کو حیا کی باتیں یاد آئیں۔

حمید نے ـــ سوچ میں ڈوبے منتظر کو دیکھا۔

"تم اپنی نفرت پر قائم رہنا۔ مت بھولنا کہ وہ تمہارے باپ کے قاتلوں کی بیٹی ہے۔ سمجھو قاتلوں کی جان تمہارے قبضے میں ہے۔ اب تو حساب چکانے کا وقت آیا ہے۔"

منتظر کے اعصاب تن گئے۔ لب بھینچ کر اس نے غصے کو روکا۔

"انتقام لو اپنی ماں کی دربدری کا۔ اپنی عمر بھر کی محرومیوں کا' میری اور بخشیل کی قید کا اور سب سے بڑی بات... اپنے باپ کے قتل کا۔"

حمید کا اک اک لفظ اس پر پوری شدت سے اثر انداز ہو رہا تھا۔ وہ اس کے ماموں ہی نہیں محسن بھی تھے۔

☼ ☼ ☼

اسے کہو کہ بہت نامراد شے ہے جنوں
اسے کہو کہ مجھے بہت جنوں ہے اس کا

یہ شعر بار بار سسکی بن کر اس کے لبوں پر مچلتا تھا۔ سارا دن گزر گیا' شام سے رات ہو گئی۔ وہ منتظر کی منتظر ہی رہی۔

اس نے نہ دن کا کھانا کھایا تھا' نہ شام کی چائے پی تھی۔ عجیب چڑچڑا پن اس کی طبیعت پر وارد ہو جاتا۔ جب حمیرا اس کو کچھ کھانے پینے کو کہتیں۔ وہ منتظر کو دل ہی دل میں کوستی رہیں۔ بیٹی کے سامنے کہنے کی ہمت نہ کر پائیں۔

وہ فون کرتی تو بند' میسج کا جواب نہ آتا۔ آفس کے فون سے' آدھے دن تک۔

"سر اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔" کا جواب۔

دوپہر کو کرتی تو۔ "سر آفس سے چلے گئے ہیں۔" کا جواب جان جلا دیتا۔ چار دن گزر گئے تھے۔ اس نے گھر میں قدم نہیں رکھا تھا۔

اس کا معمول تھا کہ وہ رات دیر تک لان میں اس کا انتظار کرتی۔ وہ مبارک گھڑی تھی کہ وہ آیا تھا مگر اس کو نظر انداز کر کے وہ تیزی سے کمرے میں چلا گیا۔

"آپ کے بغیر چار دن چار صدیوں سے کم نہیں تھے۔ آپ کو پتا ہے میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" کہتے ہوئے اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

"نہیں رہ سکتیں تو رہنا سیکھ لو۔" وہ غصے سے پلٹا۔

"ہر وقت قید کا سا احساس رہتا ہے مجھے' میں یہاں نہ اپنی مرضی سے سو سکتا ہوں۔ نہ اٹھ سکتا ہوں' نہ کھا سکتا ہوں' نہ پی سکتا ہوں' تم مسلط ہو کے رہ گئی ہو مجھ پر... کیوں؟ کیا میں تمہارا غلام ہوں' یا تمہارے باپ کا۔"

تلخ لہجے پر اس کا دل لہو بن کر آنکھوں میں ڈھل آیا۔

"منتظر...!" اس کے لب ملے۔

"بکواس بند کرو میں کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں اور ہاں! یہ ڈھکوسلے مت کیا کرو... میرے سامنے۔ پوری حمیرا لگتی ہو ڈرامہ باز۔"

وہ اس کے ماں' باپ کا ذکر ہتک آمیز انداز میں کرتا۔ مگر وہ یہ بھی برداشت کر جاتی کہ شاید اس کا غصہ آہستہ آہستہ ختم ہو جائے۔ اک امید کا دیا دل کے دوار روشن رہتا۔

☼ ☼ ☼

"یہ حقیقت ہے کہ میں اس سے شادی کے بعد خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا۔" وہ باربی کیو میں بیٹھا تھا۔ ماہم انہماک سے سنتی کھانے کے ساتھ مکمل انصاف کر رہی تھی۔ اس کی اس بات پر اس کے دل میں مایوسی اتری' وہ دونوں ایک مشہور ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔

"مگر یہ اس سے بڑی حقیقت ہے کہ اب میں خود کو بدنصیب ترین انسان تصور کرتا ہوں۔ میری بیوی وہ ہے کہ جس کے ماں' باپ نے میرے باپ کو قتل کیا۔ میری ماں پر رکیک الزامات لگائے۔ مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔" اس کے لہجے میں دکھ' پھر غصہ نمایاں ہو کر ابھرا۔ ماہم نے اس کی بات پر خوشی بھری سانس لی۔ اسے جیسے ڈھارس مل گئی۔ یک گونہ اطمینان اس کے رگ و پے میں امڈ آیا۔

اسے یک دم سب کچھ زہر لگنے لگا۔ پلیٹ اپنے آگے سے کھسکائی ٹشو سے ہاتھ پونچھے۔

"زندگی کی ساری آسائشیں' سہولتیں جو مجھے مل سکتی تھیں۔ ان لوگوں نے مجھ سے چھین لیں۔ میں ان کی بیٹی کو اپنی بیوی' اپنی شریک زندگی کیسے تسلیم کر سکتا ہوں۔"

"ایک... اک بات کہوں سر! اگر آپ برا نہ مانیں تو؟" اس نے مدھم مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ضرور... ضرور کیوں نہیں... آپ تو اس شخص کی بیٹی ہیں۔ جس نے مجھے حقیقت سے آشنائی دی۔ آپ کی کوئی بات مجھے بری نہیں لگے گی۔" وہ آہستہ سے مسکرایا۔

"آپ اگر ان سے اتنی نفرت کرتے ہیں... تو انہیں اپنی زندگی سے نکال کیوں نہیں دیتے؟" اس کے دل کی بات زبان پر آ گئی۔

"بس فی الحال کچھ مجبوریاں ہیں۔ جب شادی ہوئی تو مجھے حیا کی جائیداد کا کوئی لالچ نہ تھا۔ اس لیے اس معاہدے کا تفصیلی جائزہ لینے کی زحمت ہی نہیں کی۔ جو حسین رضا نے حیا اور میری شادی کے وقت کروایا تھا۔" اس نے پانی کا گلاس اٹھا کر چند گھونٹ بھرے۔

"ہمارا وکیل بیرون ملک گیا ہوا ہے۔ جیسے ہی آئے گا میں اس سے' معاہدے اور طلاق کے بارے میں بات کروں گا۔"

ماہم کے دل کی کلی کھل اٹھی۔ قدرت اس کے راستے کی رکاوٹ دور کرنے کا خود ہی بندوبست کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا وہ مجھے قبول کریں گے؟" بالکونی میں کھڑی ماہم ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ منتظر میرے حواس پر چھا گئے ہیں۔ پتا نہیں مجھے ان سے محبت ہو گئی ہے یا اپنی دربدری' ناآسودگی' احساس محرومی کو ختم کرنے کا اک وسیلہ سمجھ بیٹھی ہوں یا ناتمام خواہشات ان کی ذات سے پوری کرنا چاہتی ہوں۔

اس نے گہری سانس بھر کر اڑتی لٹ کان کے پیچھے اڑسی۔

"کچھ بھی ہو' ایسا لگتا ہے کہ وہ میرے لیے بے حد ضروری ہو گئے ہیں۔ اتنے ضروری کہ مجھے لگتا ہے اگر وہ نہ ملے تو میں ادھوری رہ جاؤں گی' مگر کیا وہ مجھے قبول کریں گے؟"

کئی دن کا سوال جو اندر ہی اندر کھٹک رہا تھا۔ پھر اپنی جگہ آموجود ہوا۔ مانا کہ انہوں نے بھی کسمپرسی کی زندگی گزاری ہے۔ محرومیوں میں پلے بڑھے ہیں۔ مگر پھر بھی ہے تو ملکوں کا خون اور میں ان کے باپ کے نوکر کی بیٹی۔

وہ مایوسی سے نفی میں سر ہلاتی رہی۔ یہ سوچ اس کے پورے وجود کو نڈھال کر رہی تھی۔ کیا وہ یہ طبقاتی فرق مٹانے کو تیار ہو جائیں گے۔ وہ اتنی محرومیوں کے بعد اب بھی ملک منتظر حسنین ہیں اور میں اپنے باپ کی طرح ان کی ملازم۔ اک بار پھر اونچ نیچ ہمارے بیچ آگئی ہے۔

"یا اللہ منتظر کو مجھے دے دے۔" اس نے دل سے دعا کی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کے پچھلے پہر کا سناٹا' صرف اس کمرے میں ہی نہیں اس کے دل میں بھی موجود تھا۔ اس کا ہم سفر ہم نشین' شریک حیات' اجنبیت اوڑھے سو رہا تھا۔

وہ جو محبت میں یک جان بننے کی چلہ کشی تھی۔ جب دوری ختم ہوئی تو نتیجہ دوئی کی صورت نکلا۔

دوئی بھی ایسی جہاں ایک ہی بستر پر صدیوں کا فاصلہ سمٹ آیا۔ اس نے اپنا دم گھٹتا سا محسوس کیا۔ وہ آہستگی سے اٹھی۔ اس کے پاؤں ابھی زمین پر جمے بھی نہ تھے کہ منتظر نے سرعت سے اٹھ کر اس کا بازو پکڑا۔ اس نے حیرانی سے منتظر کو دیکھا۔ جو اس کا بازو سختی سے پکڑے ہانپنے والے انداز میں اسے دیکھتا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" بے یقینی میں ڈوبی آواز میں غصہ نمایاں تھا۔

"دم گھٹ رہا تھا۔ باہر لان میں جا رہی تھی۔"

"بہانے بناتی ہو مجھ سے' جھوٹ بولتی ہو۔ ؛ مارنا چاہتی ہو نا مجھے' بولو... بولو۔"

اس نے شانوں سے پکڑ کر حیا کو جھنجوڑا۔ حیا کو اس وقت وہ پہلے والا سلجھا ہوا منتظر نہیں لگتا تھا۔ وہ بالکل ابنارمل لگ رہا تھا۔

"جب جینے کی جستجو زندگی کی لگن عروج پر ہو۔ تب بھلا کوئی اپنے آپ کو بھی مارتا ہے۔ منتظر!" حیا کے لہجے میں رنج و الم کا ہجوم سمٹ آیا۔

"غلط... غلط... غلط۔" وہ پرزور انداز میں گویا ہوا۔ "نہ میں تمہاری جینے کی جستجو ہوں' نہ زندگی کی لگن۔"

"آپ میرا سب کچھ ہیں۔" اس نے "سب کچھ" پر زور دیتے کہا۔

"میں نے تمہاری سازش ناکام بنا دی ہے۔ تب ہی ایسا کہہ رہی ہو نا؟" وہ استہزائیہ ہنسا۔

"ناگن کی بیٹی ناگن ہی ہوتی ہے۔ زہر تو تمہاری سرشت میں ہے۔" اس نے آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔ "ڈسنا چاہتی ہو مجھے' ہرانا جھکانا چاہتی ہو نا؟" سوالیہ کڑی نگاہوں میں نفرت ہی نفرت تھی۔

حیا کا دل کٹ مرنے کو چاہا۔ وہ نڈھال ہو کر وہیں بیڈ کے کونے پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ تیزی سے بھیگتا جا رہا تھا۔ منتظر جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ناکامی پر رو رہی ہو؟"

☼ ☼ ☼

"تم ماہم سے شادی کر لو۔" ایک دم سے' بنا کسی تمہید کے حمید ماموں کے اس مشورے پر وہ خاموشی سے ماموں کو دیکھنے لگا۔

"تمہیں بری لگی میری بات۔" حمید ماموں سامنے والے صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ وہ روز ماہم کو ڈراپ کرتا' چند گھنٹے ماموں کے ساتھ گزارتا' کبھی رات کو وہیں رہ جاتا' کبھی واپس گھر جاتا۔

"نہیں بری تو نہیں لگی۔"

"وہ ڈائن کی بیٹی تو تمہارا گھر بسانے سے رہی' جہاں تمہیں نیند بھی اس خوف سے نہیں آتی کہ کہیں سوتے میں قتل نہ کر دیے جاؤ۔"

وہ گہری سوچ میں ڈوب رہا۔

"کیا سوچ رہے ہو برخوردار!" ماموں نے شانے پر تھپکی دی۔

"ماموں! میں دھوم دھام سے شادی کرنا چاہتا ہوں تاکہ سارے بزنس سرکل میں یہ خبر پھیل جائے کہ حسین رضا کے داماد نے دوسری شادی کر لی۔" وہ منتقم لہجے میں گویا ہوا۔

"ہاں... ہاں... کیوں نہیں... ایسا ہی ہو گا۔ حسین رضا کی سبکی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے۔" حمید ماموں خوشی سے بولے۔

"اب دیر کس بات کی؟" ان کا بس نہ چل رہا تھا کہ فوراً اس کی شادی کر دیں۔

"بس ماموں! وکیل کے واپس آنے کا انتظار ہے۔ فیملی کو لے کر چھٹیوں پر بیرون ملک گیا ہوا ہے۔"

"وہ کس لیے؟" انہوں نے بھنویں سکیڑ کر حیرت سے پوچھا۔

"دراصل میں شادی کے وقت حسین رضا نے ایک معاہدہ کروایا تھا۔ اس وقت میں نے سرسری دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ اب یہ فیصلہ کرتے وقت میں تفصیل سے وہ معاہدہ وکیل سے لے کر پڑھنا چاہتا ہوں تاکہ پھر بہتر حکمت عملی سے سارے کام سرانجام دے سکوں۔"

"ہاں... ہاں... ضرور۔ یہ تو بڑی عقل مندی کی بات ہے بیٹا!"

☼ ☼ ☼

"سر! بیرسٹر وقار احمد آئے ہیں۔"

"او کے... اندر بھیجو۔"

"السلام علیکم مسٹر منتظر حسنین!" اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

"وعلیکم السلام! بڑے دن لگا دیے وکیل صاحب!"

"بس کیا کریں منتظر صاحب! اس دوڑتی بھاگتی زندگی سے بمشکل کچھ وقت چرا کر فیملی کے ساتھ گزارے ہیں' ورنہ کراچی کی مصروف زندگی تو آپ جانتے ہی ہیں۔"

"جی ہاں بیرسٹر صاحب! اکثر بڑے شہروں کے بڑے لوگوں کے پاس دل نہیں ہوتا۔" وہ نادانستہ کہہ بیٹھا۔ وکیل صاحب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"واپس آیا تو اسسٹنٹ نے بتایا کہ آپ ایگریمنٹ کو اک بار پھر دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ فائل ہے۔" انہوں نے فائل اس کے سامنے رکھی۔

"یہ معاہدہ باہمی رضامندی کے ساتھ حیا حسین بنت حسین رضا اور منتظر حسنین کے درمیان ہے۔ دونوں فریق حیا ٹیکسٹائل مل کے برابر کے شریک ہوں گے۔ دونوں فریق شریک حیات بن کر ساری عمر ایک دوسرے کے ساتھ محبت' عزت سے نبھائیں گے۔ ان میں سے اگر کوئی بھی فریق اس رشتے کو توڑنے یا علیحدگی کی صورت میں اپنے ففٹی پرسینٹ شیئر فریق ثانی کو دینے کا پابند ہو گا یا ہو گی۔ علاوہ ازیں یہ کانٹریکٹ حیا حسین کی مرضی و منشا کے مطابق ہو گا۔"

نیچے اس کے دستخط موجود تھے۔

اس نے تب دستخط کرتے ایک نظر بھی معاہدے پر ڈالنا گوارا نہ کی تھی۔

غصے سے اس کی کنپٹی کی رگ پھڑک رہی تھی۔ بوڑھے نے جال بچھایا' وہ اس میں پھنس گیا۔

"بیرسٹر صاحب! کوئی ایسی صورت جس میں علیحدگی کے بعد بھی مجھے اپنے ففٹی پرسینٹ شیئر سے دست بردار نہ ہونا پڑے۔"

"اس کی صرف ایک صورت ہے' اگر حیا حسین خود آپ کو ففٹی پرسنٹ شیئر دے دے۔"

"میں دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے قلم کو ہاتھوں کی دونوں انگلیوں میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔

"اس کی اجازت بھی تحریری طور پر حیا حسین سے لینی پڑے گی۔" بیرسٹر نے سگار کا کش لگایا۔

"بیرسٹر صاحب! میں آپ کو منہ مانگی رقم دوں گا کوئی حل نکالیں آپ' ایگریمنٹ کو ادھر ادھر کریں' کوئی تبدیلی وغیرہ۔" وہ پریشانی سے بولا۔

"منتظر صاحب! یہ معاہدہ ہمارے پورے پینل کے پاس ہے' صرف میرے پاس نہیں اور آپ دونوں قانونی طور پر ایک دوسری کی املاک کے وارث ہیں۔ ذاتی اور کاروباری زندگی میں ایک دوسرے کی رضا مندی کے قانونی محتاج.... اگر کچھ کر سکتی ہیں تو صرف آپ کی مسز ہی کر سکتی ہیں۔ آپ اپنی وائف کو راضی کریں۔"

"اب مجھے پھر اس ڈائن کی بیٹی کے آگے دست سوال دراز کرنا پڑے گا۔" اس سوچ کے آتے ہی اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

وہ تیزی سے سیل اٹھا کر باہر نکلا۔

"سر! یہ فائل؟" ماہم جو اندر آ رہی تھی' اسے یوں باہر جاتے دیکھ کر ٹھٹکی۔

"یہ رکھ دیں۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔"

ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ حسب معمول ڈرائیونگ سیٹ خود سنبھال کر اس نے ماہم کے لیے اگلا دروازہ کھولا اور تیزی سے گاڑی نکال کر لے گیا۔ رخ ماہم کے فلیٹ کی طرف تھا مگر وہ سارے راستے خاموش رہا۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے اس کے چہرے کے تناؤ کو دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

"عیاری تو دیکھو حسین رضا کی۔" بخشل بولا۔ وہ سب سر جوڑ کر اس مسئلے کو سلجھانے بیٹھے۔

"اگر تم دست بردار ہو جاؤ' تو تمہارے پاس کتنے اثاثے ہیں؟"

"ماموں! سارے اثاثے ان ہی کے ہیں میرے پاس اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں صرف ایک کروڑ ہیں۔" وہ بے دلی سے بولا۔

"یہ فلیٹ؟" بخشل نے سگریٹ کا دھواں ناک سے نکالتے ہوئے کہا۔

"ان ہی کا۔"

"گاڑی؟"

"ان ہی کی۔"

"برخوردار! انہوں نے تمہیں بالکل ہی خالی ہاتھ اور اپنا دست نگر رکھا ہے۔ لیکن فکر کی بات نہیں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔"

وہ ماموں کو بغور دیکھنے لگا۔

"میرا بیٹا! دشمن کی بیٹی کی زندگی ہے' مر جائے گی اس کے بغیر۔"

ماہم کو لگا جیسے کسی نے دل مٹھی میں جکڑ لیا ہو' جی بھر کے بددل ہوئی۔

"اس کی محبت سے فائدہ اٹھاؤ۔ نفرت بھی اپنے ساتھ باندھ کے رکھو' اور اپنے بھی سارے کام نکالتے رہو۔" حمید کا انداز رازدارانہ رہا۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے' آزماؤ اس کی محبت کو۔" بخشل جذباتی ہوا۔

"پریشانی کسی مسئلے کا حل نہیں بیٹا!" حمید نے اس کا کاندھا تھپکا۔

"آج کھانے میں کیا بناؤں۔" خورشید نے روز کا مسئلہ سامنے رکھا۔

"ارے یہ اپنے بچے جا رہے ہیں نا' خود کھا کر آئیں گے' ہمارے لیے لے کر آئیں گے۔" بخشل ہنسا۔

"بس جلدی آنا۔ زیادہ بھوک برداشت نہیں ہوگی۔" حمید نے خوش ہوتے کہا۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہوا ہے یار! اگر انشین ہو گئی ہو' کال ریسیو نہیں کرتیں' فون کرو تو ملازمہ جواب دیتی ہے۔ بی بی تو اپنے کمرے میں ہیں۔" مہرین کمرے میں داخل ہوتے ہی

گئی شکوے بیٹھی۔ وہ خاموشی سے غائب دماغی سے اسے دیکھتی رہی۔

"کیا ہوا؟ منتظر بھائی کے ساتھ کوئی ٹینشن چل رہی ہے۔ آنٹی بتا رہی ہیں' وہ چند دن سے گھر بھی نہیں آئے۔"

اس کا دل بھر آیا۔ چاہنے کے باوجود بھی جواب نہ دے سکی۔ اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"تم نے بلایا؟ فون پر بات ہوئی؟"

"کئی بار.... فون اٹھاتا ہی نہیں۔" گلے میں پھر کچھ اٹکا' آنکھوں میں مرچیں سی بھر گئیں۔ ہر منظر دھندلا گیا۔ مہرین نے اس کے ہاتھ پکڑ کر تسلی دی۔

"مردوں کی عادت ہوتی ہے ادھر ادھر منہ مارنے کی' سنبھل جائے گا' حوصلہ رکھو۔"

"تمہیں شاید حقیقت کا علم نہیں۔"

"ارے سب علم ہے۔ چھوڑو یہ رونا دھونا۔ اٹھو فریش ہو جاؤ' کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا مہرین۔"

اسے پانا' اسے کھونا' اسی کے ہجر میں رونا
یہی گر عشق ہے محسن' تو ہم تنہا ہی اچھے ہیں
اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے مزاحیہ انداز اختیار کیا۔

حیا کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔ مہرین نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"چلو اٹھو' تھوڑا موڈ بہتر ہو جائے گا۔"

وہ باربی کیو ــــ آگئیں۔ آرڈر دے کے چاروں طرف جائزہ لینے کے لیے نظریں گھمائیں۔ مگر نظر نے لوٹنے سے انکار کر دیا۔

مہرین نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔

"اوہ!" اک گہری سانس خارج ہوئی۔

"ان کو میں ایک بار گاڑی میں بھی دیکھ چکی ہوں۔ میں سمجھی کہ منتظر بھائی اپنی رحم دل طبیعت کی بنا پر ماہم کو گھر ڈراپ کرنے جا رہے ہیں۔ مگر بات شاید اور ہے۔"

کتنا اذیت ناک منظر تھا۔ وہ جس دیوتا کی پجارن تھی۔ وہ دیوتا کسی اور کے ساتھ تھا۔ کتنا خوش نظر آ رہا تھا ماہم کے ساتھ۔ ہشاش بشاش' باتیں کرنے میں مگن بیٹھا تھا۔

مہرین نے اس کے زرد پڑتے وجود کو دیکھا۔

"خود کو سنبھالو حیا! بعض دفعہ زندگی میں بہت تکلیف دہ حالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سب سہنا پڑتا ہے۔ چلو واپس چلتے ہیں۔"

اس نے منتظر سے بات کرنے کا ارادہ ملتوی کر کے حیا کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا۔

اسے لگا جیسے وہ مردہ وجود کو گھسیٹتی جا رہی ہے۔

"تو یہ طے ہے' منتظر حسین کہ اب تم میری طرف نہیں لوٹو گے۔"

☆ ☆ ☆

رات بیت رہی تھی اور وہ فراق یار میں گھل رہی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی محبت کی ہی نہیں تھی۔ ماں' باپ کی آنکھوں کا تارا لاڈ اٹھاتے اٹھاتے اسے بڑا کیا۔ اسکول' کالج' یونیورسٹی کے دور سے گزر کر وہ پریکٹیکل لائف میں قدم رکھ رہی تھی۔ جب حسین رضا نے اس کے نام پر ٹیکسٹائل مل لگانے کا منصوبہ بنایا اور اچانک اک دن بابا منتظر حسین کو لے آئے۔

"یہ بڑا قابل اور محنتی نوجوان ہے۔ میں نے ابھی سے مل کی جی ایم کی پوسٹ پر اپائنٹ کر لیا ہے۔ سارے تعمیراتی کاموں کی نگرانی بھی اس کے ذمے ہوگی۔"

اس پہلی ملاقات نے اس پر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کا سب کچھ لے گیا۔ محبت کا اک اک لمحہ احساس کے کواڑوں سے جھانک رہا تھا۔

جب سے مہرین اس کو چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے ایک ہی جگہ بیٹھی تھی۔

آدھی رات کو دروازہ کھلا۔ وہ اندر آیا۔ اچھی طرح سے لاک لگایا' پلٹا' اس کو نظر انداز کر کے واش روم میں چلا گیا۔ چینج کر کے آیا تو پہلی بار اس کو بغور دیکھا۔

"تم یوں بیٹھ کر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ پلٹ کر اس کی طرف آیا' ٹھوڑی سے پکڑ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

"تم سمجھتی ہو کہ میں متاثر ہو جاؤں گا کہ میری مشرقی بیوی رات گئے میرے انتظار میں جاگتی رہتی ہے۔ خام خیالی ہے تمہاری۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

اس کی آنکھیں نئے سرے سے مرچوں سے بھر گئیں۔

"یہ... یہ آنسو مجھے موم نہیں کر سکتے۔ بند کرو یہ ڈراما۔" اسے جھٹک کر پیچھے ہٹا۔ اس کا شہر دل لٹ چکا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی گھٹی گھٹی سسکیاں اس کے بے آواز بینوں میں شامل ہو گئیں۔

"مختظر پلیز... میرے ساتھ ایسا مت کریں۔ میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ آپ کے ساتھ خوش رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے بازو سے پکڑ کر ایک بار پھر بھیک مانگی۔

"میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر' تمہارے ماں باپ پر اور اس گھٹیا بندھن پر۔" اس نے جھنجلاتے ہوئے اپنا بازو چھڑا کر اسے دھکا دیا وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ زمین کے اوپر جا گری۔

اس کی محبت بھری جھوک کو نفرت کا سم و کلر چاٹ رہا تھا۔ دل بنجر بن رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت خوش تھی۔ آج اس کی سنگت میں خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کیا تھا۔

وہ سونے کے لیے لیٹی تھی۔ اس کے سیل پہ بیل ہوئی۔ اس نے فوراً" اٹھایا۔ مبادا مختظر نہ ہو مگر اسکرین پر مہرین کا نام آرہا تھا۔

"ہیلو... السلام علیکم مہرین! کیسی ہیں؟"

"کیسا ہونا چاہیے؟" چبھتا ہوا لہجہ۔

"جیسی ہمیشہ ہوتی ہیں' زندہ دل' خوش مزاج' خوش باش۔" ماہم ہنسی۔

"اوہ تم اب بھی مجھ سے یہی توقع رکھ رہی ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"جان بوجھ کر انجان نہ بنو؟"

"یقین کریں... مہرین میں نہیں سمجھی۔"

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟ کون سی امید؟ میں واقعی نہیں سمجھ پا رہی ہوں۔"

"سمجھ بھی کیسے سکتی ہو جھونپڑی سے اٹھ کر محلوں کے خواب جو دیکھ رہی ہو۔"

"پلیز الزام تراشی مت کریں۔"

"میں نے تمہیں آج خود مختظر بھائی کے ساتھ ڈنر کرتے دیکھا ہے۔ تم... اس کی معمولی سی ملازمہ آخر کس حیثیت سے اس کے ساتھ گلچھرے اڑا رہی ہو۔"

"زبان سنبھال کر بات کریں مہرین!"

"ڈسا ہے تم نے اپنی محسن کو ڈسا ہے' جس نے میرے صرف ایک بار کہنے پر تمہیں فوراً" جاب دی۔ کتنی کم ظرف ہو تم۔"

"جی حیا اور ان کے والدین کا ظرف بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔" ماہم کا لہجہ طنزیہ ہوا۔

"تمہارے جیسے کمی کمین لوگوں سے یہی توقع رکھی جا سکتی ہے۔" مہرین کی طیش بھری آواز ابھری۔

"یاد رہے مختظر بھی اک کمی کمین عورت کا ہی بیٹا ہے جسے حیا نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔"

"ہاں تب ہی بھگت رہی ہے وہ..."

"مہرین صاحبہ وہ صرف اپنے والدین کا کیا بھگت رہی ہے۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دے کر سیل ہی آف کر دیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے سے قطرے نمودار ہوئے۔ اب کیا ہوگا۔ اس کی نیند اک بار پھر اڑ گئی۔ ساری خوشی ہرن ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

صبح رات کا بوجھل پن لیے نمودار ہوئی۔ وہ بیڈ پر نیم دراز شاید ساری رات روتی رہی تھی۔ اک کے لیے اسے اس پر ترس آیا۔ پھر فوراً" جھٹلایا۔

"ڈائن کی بیٹی ڈائن۔"

حیا کی مندی آنکھیں کھلیں تو نظر اس کی پشت پر پڑی۔ دھڑام سے دروازہ بند ہوا۔ وہ بوجھل دل بوجھل وجود' بوجھل آنکھیں لیے فوراً" اٹھی۔ اس کے پیچھے لپکی۔

"مستظر! ناشتہ!"

اس کی آواز پر وہ رکا۔ پلٹا تو سامنے سے ناشتے کے لیے آتے حمیرا اور حسین رضا کو دیکھا۔

حمیرا کو دیکھتے ہی اس کے اندر سے لاوا ابل پڑا۔

"اوہ رات کے ڈنر سے سیرابی نہیں ہوئی۔ ابھی ناشتے کی بھی ضرورت ہے۔" وہ دل جلانے والی مسکراہٹ سے اس کے سامنے آیا۔ اس نے گھبرا کر سامنے کھڑے ماں' باپ کو دیکھا۔

"تم یہ کیا کر رہے ہو ہماری بیٹی کے ساتھ؟" حمیرا بھڑیں۔

"جیسا آپ نے میرے باپ کے ساتھ کیا تھا' ویسا ہی۔" اس نے حمیرا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر طنزیہ کہا۔

"ہم نے تمہارے باپ کے ساتھ کچھ نہیں کیا' جو کیا تمہاری ماں نے کیا۔"

"بکواس بند کرو مکار عورت!" وہ دھاڑا۔

"ہمارے گھر میں بیٹھ کر' ہمارا کھا کر ہم پر دھاڑتے ہو۔" حمیرا چیخیں۔

"اور تم لوگ جو سالوں تک میرے باپ کی جائیداد ہڑپ کر کے بیٹھے ہو' تمہاری رگوں سے کھینچ کے نکالوں گا اپنی جائیداد۔"

"کنگلے! تھا کیا تمہارے پاس' گلے پڑ گئے ہو ہمارے۔"

"حمیرا بیگم! یہ مل میرے باپ کی جائیداد سے بنی ہے۔ احسان نہیں کیا آپ نے۔ نہ مجھے بخشش میں دی ہے۔" وہ حسین رضا کے مدمقابل آیا۔ "یہ میرا حق ہے۔ وہ حق جو آپ نے میرے باپ سے چھینا تھا۔"

"کوس رہا ہوں اس دن کو جب تمہیں داماد بنانے کی پیش کش کی تھی۔ سوچا بھتیجا ہے' زندگی کی خوشیوں پر اس کا بھی حق ہے' مگر تم تو انتہائی محسن کش نکلے۔" ان کے لہجے میں افسوس' دکھ' کیا کچھ نہ تھا۔ وہ دل کھول کر طنزیہ ہنسا۔

"بھول گئے مسٹر حسین رضا! کہ ہر بازی پلٹنے والا اوپر بیٹھا ہے۔" انگلی آسمان کی طرف اٹھائی۔ "آپ جیسوں کو مکافات عمل سے گزارنے والا۔ آپ چاہیں تو بھی اس سخت پکڑ رکھنے والے کی پکڑ سے نہیں بچ سکتے' بس کبھی وہ خود پکڑ لیتا ہے۔ کبھی کسی انسان کو وسیلہ بنا دیتا ہے۔ پکڑنے کا بہت برے پھنسے ہیں حسین رضا! چاہیں بھی تو اپنی گردن نہیں چھڑا سکتے۔"

حیا تو پہلے ہی سکتے میں تھی۔ حسین رضا اور حمیرا پر بھی سکتہ طاری ہو گیا۔ حقیقت کے ڈر نے ان کو لرزا دیا۔ مختظر حسنین سرعت سے باہر نکلا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ صبح تک ایک فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ آفس پہنچتے ہی اس نے پیون سے سر کے آنے کا پوچھا۔

"صاحب ابھی نہیں آئے۔"

جب سے اس نے جوائن کیا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اتنا لیٹ ہو گیا ہو۔ وہ لیٹر ٹائپ کر کے مختظر کی منتظر تھی۔

ٹھیک دس بجے وہ آفس میں داخل ہوا۔ وہ فوراً" اس کے پیچھے لپکی' خاموشی سے فائل اس کے سامنے رکھ کر پلٹی۔ مختظر نے اک سرسری نظر فائل پر ڈال کر اس کو پکارا۔

"مس ماہم!" وہ دروازے سے باہر نکلتے نکلتے رکی۔

"ادھر آئیے۔" وہ آہستگی سے واپس مڑی۔

"بیٹھیے۔" تحکمانہ لہجہ۔

اس نے اک نظر مختظر کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر غصے کی لہر ابھر آئی تھی۔ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" کاغذ ہاتھ میں اٹھا کر لہرایا۔

"میرا ریزائن سر!"

"کیوں؟"

"سر! ہمیں رات ڈنر کرتے آپ کی وائف اور مہرین نے دیکھ لیا۔"

"مجھے پتا ہے اس بات کا۔" اس نے بیچ میں اس کی بات کاٹی۔ "پھر۔" سوالیہ نگاہیں اس پر مرکوز کیں۔

"سر! جو ملازمت دلوا سکتے ہیں' وہ نکلوا بھی تو سکتے ہیں نا؟" اس کے بجھے بجھے سے لہجے پر وہ مسکرایا۔

"یقیناً" ملازمت دی ان کی مرضی سے تھی۔ مگر نکالوں گا اب اپنی مرضی سے۔ اطمینان رکھیے! اب اگر نکلیں گے تو اکٹھے ہی نکلیں گے۔" وہ پہلی بار مسکرایا۔

ماہم کے سر سے منوں بوجھ اتر گیا۔

"رات میں نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا اور میں یہی چاہتا تھا کہ وہ ہمیں دیکھ لیں۔ اسی لیے صف ماتم بچھی ہوئی تھی ان کے ہاں۔" وہ محظوظ ہو کے ہنسا۔

☼ ☼ ☼

تم جو کہتے ہو کہ کیوں ہوتے ہو اس بن بے چین
اے ناصح! تنگ نہ کر' بس کہ جو دیا ہوتے ہیں

پورے تین دن ہو گئے تھے اسے آئے ہوئے۔ وہ حسب معمول اس کا فون اٹینڈ کر رہا تھا' نہ میسج کا جواب دے رہا تھا۔

وہ کیسے یار منائے' کیسے دل کو بہلائے اور اگر یار نہ مانے تو ہم تو کوئی گر نہ تھا اس کے پاس یار کو بھلانے کا۔

گریہ۔ گریہ صرف گریہ تھا جو اس کے بس میں تھا۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا اک بہانہ تھا یا قرینہ۔

کمرے کی افسردہ بوجھل فضا میں وہ خوشگوار جھونکے کی مانند آیا تھا۔

اس نے دیدۂ بیدار میں بے پناہ چاہت کا جہان سمو کر اسے دیکھا۔

وہ اس کے قریب آیا' جیب سے چیک نکال کر اس کے سامنے لہرایا۔

"اس پر دستخط کر دو۔" کتنے دنوں بعد اس کا لہجہ اور رویہ نارمل تھا۔ وہ بھول گئی ساری کج ادائیاں' رسوائیاں' اس کے سامنے اس کا محبوب پوری دل فریبی کے ساتھ موجود تھا۔ اس نے فوراً "ہاتھ سے چیک لے کر دستخط کر دیے۔ اس نے یہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا کہ کتنی رقم کا چیک ہے۔ اسے جب بھی بڑی رقم کی ضرورت ہوتی تو وہ جوائنٹ اکاؤنٹ سے چیک کیش کرواتے' وہ چیک دے کر بتاتا اتنی رقم اس کام کے لیے چاہیے' وہ دستخط کر دیتی۔

مگر آج اس کی زندگی میں وہ لمحہ تھا جو ہر سچی محبت کرنے والے کی زندگی میں آتا ہے۔ جب محبوب کو دیکھنے کی خواہش زندگی کی قیمت پر بھی قبول ہوتی ہے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی چیک کی رقم پر غور نہیں کیا۔ اس کا محبوب اس کے سامنے تھا پاس تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے تھا۔ دل مضطر کو قرار دیا۔ بے سکونی سکون میں پنہاں ہوئی۔ بے قراری قرار کے سینے میں سمٹی۔ بے چینی نے چین کو چوم لیا۔ محبت پر اس لمحے کاملیت کا نزول ہو رہا تھا۔

وقت تھم جانے کی خواہش پوری شدت سے ابھری۔

اس سے چیک لے کر وہ جانے کے لیے مڑا تو دل کو جیسے شعلوں نے گھیر لیا۔ وہ برق رفتاری سے اٹھی۔ اس کے راستے پر محبت کا کشکول لے کر کھڑی ہو گئی۔

وہ بے نیاز بنا رہا۔

"خدا کے لیے رک جاؤ۔" وہ گڑگڑائی۔ وہ بے نیازی سے مسکرایا۔

"میں نہیں رہ سکتا تمہارے ساتھ۔"

"اور میں نہیں رہ سکتی آپ کے بغیر۔" اس نے پھر التجا کی اور سیل رواں نے اس کے سراپے کو دھندلا دیا۔ اس کے اندر کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹ رہا تھا۔ وہ مسکرایا۔

"بالکل اپنی ماں کی طرح جنونی اور مکار ہو۔" یہ کشکول بھرنے لگا۔ وہ بہت سخی' بڑا فیاض تھا۔ دکھ دینے میں۔

"اور اپنے باپ کی طرح چالاک' شکاری۔ جال میں پھانسنے والی۔"

ہلکے قہقہے نے سماعتوں میں تیزاب پھینکا۔ وہ اندر تک جھلس گئی۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا! آپ نے تین کروڑ کے چیک پر دستخط کرنے سے پہلے کچھ سوچا ہوتا' کچھ پوچھا ہوتا' کس کام کے لیے یہ رقم اسے چاہیے' کیوں لے رہا ہے۔"

بوجھل رات کے بعد بوجھل دن جب اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کے باپ نے آتے ہی اضطراب سے اس سے کئی سوال پوچھے۔ اس نے خالی نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا۔

"رقم دیکھی کس نے تھی؟" خود کلامی پر حسین رضا نے ٹھنڈی سانس لی۔

"دیکھو بیٹا! اسے باندھ کے رکھنے' مجبور کرنے کے طریقے اپناؤ' ترساؤ اسے' ہر چیز کے لیے' مجھے پتا ہے' وہ کچھ نہیں کر سکتا تم سے الگ ہو کر۔ وہ اتنی آسائشات کا عادی ہو چکا ہے کہ اب اپنی اصلی زندگی کی طرف لوٹ کر جانے کی غلطی کبھی کر ہی نہیں سکتا۔"

"وہ اپنی اصلی زندگی کی طرف تو اب لوٹا ہے۔ پہلے تو ترس کر جیا ہے۔ وہ آپ کا بھتیجا ہے بابا! یہ کیوں بھول جاتے ہیں آپ!"

حسین رضا لاجواب ضرور ہوئے مگر ہار نہیں مانی۔

"مگر اس سب کا مالک وہ نہیں آپ ہیں بیٹا!"

"قدرت نے اسے میرا صرف شریک سفر ہی نہیں شریک' دولت ملکیت بھی بنا دیا ہے۔" وہ خیال یار کے پہلو سے کھسکنے کو کسی طور راضی نہیں ہوئی۔ حسین رضا نے آنکھیں موند کر اپنے تئیں اس کی عقل کا ماتم کیا۔

"اس نے یہ رقم جوائنٹ اکاؤنٹ سے ذاتی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروائی ہے۔ وہ آپ سے محبت نہیں کرتا۔ صرف آپ کی دولت کو استعمال کرنے کی خاطر یہ بندھن نہیں توڑ رہا۔" انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"محبت عقل سے نہیں دل سے کی جاتی ہے بابا جان! آپ کی دلیلیں چاہے کتنی ہی وزنی ہوں' مگر میرے دل کے نزدیک بے وزن ہیں۔"

"اسے اتنے اختیارات مت دو بیٹا! مل کے معاملات خود دیکھنا شروع کر دو۔"

وہ ڈوب گئی سیل رواں میں' حسین رضا بھول گئے اپنے دلائل اور بھاری رقم کو۔ صرف اور صرف انہیں اپنی بیٹی اور اس کا درد یاد رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"بابا! دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ ہر کام اس سے نکلواؤ' محبت کرنے والے بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔ اگر وہ تم سے سچی محبت کرتی ہے تو تم اس کی محبت سے فائدہ اٹھاؤ۔" ڈی ایچ اے میں بنگلہ دیکھتے حمید ماموں خوش ہو رہے تھے۔

"اتنے بڑے خوب صورت گھر میں ہم رہیں گے؟" بخشل چاروں طرف دیکھتے حیرت سے بولا۔

"ہاں اس گھر میں ہم سب رہیں گے۔" خضر نے مسکرا کر ماہم کو دیکھا۔ ماہم کے اندر تک طمانیت سرایت کر گئی۔

"گھر تو لگ ہی نہیں رہا۔ جنت ہے جنت۔"

حمید کی تو جیسے آنکھیں ہی کھل گئی تھیں۔

"بس یار! سالوں تک جہنم کی قید کاٹ کر آئے ہیں۔ اب اللہ نے زمین پر ہی جنت دے دی۔ شکر ہے اس رب جلیل کا۔" بخشل کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

"اس قارون کی ملکیت پر ہم عیش کریں گے۔"

حمید کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

"ماموں! میں اپنی نفرت کی زمین میں دھنسا دوں گا اس قارون کو۔" خضر کے لہجے میں انتقام کا عزم تھا۔

"یہ کمرا تو میں نے اپنے لیے لیا ہے۔ ہمارا بیڈ روم۔" وہ ماہم کو دیکھ کر مسکرایا۔

ماہم سب کے سامنے خجل ہو گئی۔

"اور آپ لوگوں کو جو کمرا پسند آئے۔ وہ اپنے لیے سیٹ کر لیں۔"

"میں تو تمہارے کمرے کے ساتھ والے کمرے

میں رہوں گا۔" حمید نے فیصلہ کرلیا۔
"اور اس کے ساتھ والا ہم لے لیں گے۔" بخشل نے اپنا فیصلہ سنایا۔
"یہ پیسے تو سارے لگ گئے گھر میں۔ شادی کا خرچا؟" حمید ماموں کو پھر نئی فکر لگ گئی۔
"ماموں! کیوں پریشان ہوتے ہیں شادی کے اجازت نامے کے ساتھ خرچے کا چیک بھی سائن کروالوں گا۔" وہ حمید کے گلے میں بازو ڈالتے گویا ہوا۔
"اوہو۔۔۔ یہ تو میں بھول گیا کہ ہمارے پاس سونے کی چڑیا ہے۔" وہ دونوں کھلکھلا کر ہنسے۔
ماہم کے انگ انگ سے سرشاری عیاں تھی۔
"خوش ہو نا؟" سارا گھر گھومنے کے بعد وہ اس کے مدمقابل آیا۔
"کیا اظہار کی ضرورت باقی ہے؟" اس نے جواب کے بدلے سوال داغا۔
"نہیں۔۔۔ تم سراپا اظہار ہو۔" وہ مسکرایا۔
"اور آپ سراپا محبت۔" ماہم نے کہا۔
اس کے چہرے کے تاثرات سنجیدہ ہوگئے۔
"تم سراپا محبت ہو منتظر!" حیا کی کھلکھلاہٹ اس کی سماعت میں نمودار ہوئی۔
اس نے سر جھٹلا کر سماعت کو بہرہ کیا۔

☼ ☼ ☼

بعض دفعہ انسان کو اپنے عمل کا حساب اولاد کے فعل میں دینا پڑتا ہے۔ حیا کی محبت نے حمیرا کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کتنے دنوں تک وہ کھل کر بیٹی سے بات کرنے کی ہمت نہ کرسکیں۔ نہ ہی حیا پہلے کی طرح ان کے پاس آکر بیٹھتی مشورے کرتی۔ اس کا رویہ بہت خراب تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر آتی نہیں اگر آبھی جاتی تو ماں کو دیکھنا بات کرنا اسے گوارا نہ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چراتی رہتیں۔
زندگی میں پہلی بار انہیں احساس ہوا۔ اپنے جنون غلطیوں کا وہ ماں تھیں حیا کی حالت سے پریشان کسی کل چین نہ تھا۔ اگر حیا رنجیدہ تھی تو خوش وہ بھی نہ تھیں۔ اس کو اس حالت سے ہر حال میں نکالنا چاہتی تھیں۔ سو اپنی پوری ہمت مجتمع کرکے ماں کے مان کے ساتھ وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں۔
وہ بہت نفیس طبیعت کی مالک' اپنے کمرے کو صاف ستھرا رکھنے والی حیا' یوں خود سے بے خبر ہوگئی تھی۔ کمرا سارا الٹ پلٹ تھا۔
یہ سوٹ اس نے پانچ دن سے پہنا ہوا تھا۔ اس دیوانی جنونی سے بیٹی کی دیوانگی دیکھی نہ جاتی۔
"حیا!" ان کی زبان سے صرف یہ تین حرفی لفظ ادا نہ ہوا تھا۔ بلکہ ممتا کی پوری تڑپ اور محبت تھی اس پکار میں۔
بیڈ پر لیٹی حیا نے کروٹ بدل کر ماں کو دیکھا۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئیں۔ اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔
"بیٹا! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"
"یقیناً" آپ سے تو بہتر ہی ہے۔"
وہ حیا کے لہجے میں چھپے ماضی کے طنز کو نگل گئیں۔
"مجھ سے تمہاری یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔" آواز روہانسی تھی۔ "خود کو سنبھالو بیٹا۔"
"آپ سنبھل پائی تھیں؟"
ان کے پورے جسم میں جیسے لرزش ہوئی تھی بمشکل تھوک نگلا۔
"جو غلطیاں ہم سے ہوئیں تم تو ان غلطیوں کو نہ دہراؤ۔ ہم سے تمہارا دکھی ہونا دیکھا نہیں جاتا۔"
"آپ کی وجہ سے کتنے لوگ دکھی ہوئے ہیں۔ کبھی آپ نے یہ سوچا؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "آپ نے کبھی کسی کا خیال رکھا' رکھا تو صرف اپنے دل کا۔" وہ تاک تاک کر حملے کررہی تھی۔
"تم میرے جگر کا ٹکڑا ہو بیٹا! مجھے یوں تو زخمی مت کرو۔"
"پتا چل رہا ہے نا زخم کتنا درد دیتے ہیں۔ آپ نے کھائے ہی کب ہیں کہ عادت ہو۔ آپ نے تو صرف زخمی کرنا سیکھا ہے' ہونا نہیں۔"
اس کے لہجے کی تپش پر وہ موم کی مانند پگھل رہی

تھیں۔ ان کی لاڈلی بیٹی حقیقت کی چٹان بن کر استادہ تھی۔

☼ ☼ ☼

بقول شاعر وہ سر پر خیال یار کی چادر تان کر بیٹھی تھی۔ جب ملازمہ نے اسے وکیل کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر ڈرائنگ روم میں آئی۔
"السلام علیکم! بیٹا کیسی ہیں آپ؟" بیرسٹر وقار احمد نے کھڑے ہو کر اپنائیت سے پوچھا۔
"وعلیکم السلام انکل! الحمد اللہ! آپ کیسے ہیں۔" اس نے بڑی مشکل سے دنیاداری نبھائی۔
"اللہ کا شکر۔" وقار صاحب نے عاجزی سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ چند لمحے توقف کیا۔ ٹھنڈی سانس لی۔
"آپ کے لیے ایک بری خبر ہے بیٹا! آپ کو سناتے ہوئے بھی ڈر رہا ہوں۔"
"فکر نہ کریں انکل! میں اب بری خبروں کی عادی ہوچکی ہوں۔"
ملازمہ نے چائے لوازمات کے ساتھ ان کے آگے رکھی۔
"یہ فائل آپ خود دیکھ لیں۔" انہوں نے ٹیبل پر رکھی فائل کی طرف اشارہ کیا۔
اس نے فائل اٹھا کر اس میں پن اپ کی ہوئی تحریر پڑھی۔
خیال یار کی چادر سر سے سرک گئی۔
سیاہ ہجر زدہ لباس میں وہ درد کے درمیان گر گئی۔
گویائی گل ہوئی' محبت کا چراغ بجھ رہا تھا۔ ہجر کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔
"مجھے پتا تھا بیٹا! آپ کو شدید صدمہ پہنچے گا۔" اس کا متغیر چہرہ دیکھ کر بیرسٹر وقار خود پریشان ہوگئے۔
وہ مردہ ہورہی تھی' بالکل بے جان۔
حمیرا اندر داخل ہوئیں۔ اس کے خاموش وجود کو دیکھا۔ بہتے آنسوؤں پر تڑپ کر فائل اس کے ہاتھ سے لی اور زور سے دیوار پر دے ماری۔
"بھاڑ میں جائے منحوس انسان۔ نالی کا کیڑا' میری بیٹی کے لائق ہی نہیں تھا۔ ایک چھوڑ دس شادیاں کرلے۔ ہماری بلا سے۔ ہماری جوتی کو بھی پروا نہیں۔" وہ اور غبار نکالتیں اگر وقار صاحب اسے حیا کے بے ہوش وجود کا احساس نہ دلاتے۔
"میری بچی حیا۔۔۔ حیا!" تڑپ کر حیا کو بازو میں بھرا۔ حیا کا سر ان کے کاندھے پر گر گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ حیا کو سکون آور ٹیبلٹ دے کر وہ اپنے کمرے میں آئی تھیں۔
"حیا کی یہ حالت۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں' کیسے خوشیاں خریدوں اس کے لیے۔" حسین رضا بے بس تھے۔
"اس نے شادی کی اجازت مانگی ہے۔ اسے جواباً طلاق کا مطالبہ بھجوادو۔"
"اور اگر اس نے طلاق دے دی تو؟" حسین رضا نے سوالیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔
"تو اچھا ہے۔ جان چھوٹ جائے گی خبیث سے۔"
"ہاں جان تو چھوٹ جائے گی' مگر کیا حیا مانے گی؟"
"وہ بچی ہے حسین رضا! ہم اس کی پھر کسی اچھی جگہ شادی کردیں گے۔" اپنی دانست انہوں نے فیصلہ سنادیا۔
"وہ خوش رہ سکے گی۔ تمہاری بیٹی ہے؟"
نہ چاہتے ہوئے بھی حسین رضا کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔
"تم اور تمہاری بیٹی مجھے طعنے ہی دیتے رہنا۔۔۔" وہ غصے سے چیخیں۔
حسین رضا نے خاموشی سے سگار جلالیا۔ خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگے۔
حمیرا سے مزید بحث سے گریز کیا۔ وہ چیخنے چلانے لگتیں۔ وہ دنیا کے لیے کیسی بھی ہوں' بہرحال ان کو اور حیا کو دل و جان سے چاہتی تھیں۔
کتنی ہی دیر بعد حمیرا کو اپنے لہجے کی سختی کا احساس

ہوا۔

"سنو! میری بات مانو تو یہی ہم سب کے حق میں بہتر ہے۔ اسے لالچ دو اور کہو خود ہی حیا کو طلاق دے دے۔ ہمارا نام لیے بغیر۔"

"حیا جیتے جی مر جائے گی۔" حسین رضا نے جیسے خود کلامی کی۔

"وہ اب بھی پل پل مر رہی ہے۔ صدمہ ضرور ہوگا' مگر ان شاء اللہ سنبھل جائے گی۔ ہاں کچھ وقت ضرور لگے گا۔"

ان کے پُرسوچ انداز نے حمیرا کی ہمت بڑھائی۔

"تم بات تو کر کے دیکھو اس سے۔"

✲ ✲ ✲

"بیرسٹر صاحب! آپ نے اجازت نامہ نہیں بھیجا۔ میں سارا دن انتظار ہی کرتا رہا۔" رات دس بجے اس نے فون کر ہی ڈالا۔

"اجازت نامے پر سائن ہوتے تو بھیجتا نا۔" بیرسٹر صاحب نے بے دلی سے جواب دیا۔

"کیوں؟ کیا حیا نے سائن کرنے سے انکار کر دیا؟"

"وہ ہوش میں ہوتی تو انکار کرتیں نا؟"

"کیا مطلب میں سمجھا نہیں بیرسٹر صاحب!"

"وہ تو اجازت نامہ دیکھ کر ہی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ پھر مجھے نہیں پتا کیا ہوا۔" انہوں نے تلخی سے کہہ کر سیل آف کر دیا۔

اس نے پھر کال کی' نمبر بند کا جواب موصول ہو رہا تھا۔

اسے صدمہ ہوگا۔ یہ اندازہ تھا۔ مگر اتنا شدید ہوگا' یہ پتا نہ تھا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا' وہاں سکوت تھا۔ تھوڑی سی گھبراہٹ ہوئی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر ٹی وی لاؤنج میں آیا۔ وہاں سب بیٹھے تھے۔ ان کو اطلاع دی۔

"لو ہو... برخوردار! اب دعا کرو' وہ زندہ بچ جائے۔ ورنہ حسین رضا ہمارے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔"

حمید ماموں کے لہجے پر' انداز پر اسے حیرت نہیں ہوئی۔ وہ ان کی فطرت سے واقف تھا۔

"ہاں دعا تو کرنی ہی پڑے گی' ورنہ صرف جان کے لالے ہی نہیں پڑیں گے۔ خالی ہاتھ بھی رہ جائیں گے۔" بخشل کی فکر انگیز آواز ابھری۔

ماہم نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس کے تاثرات سے وہ اس کے دل کا حال نہ جان پائی۔

اپنے مستقبل کی فکروں نے اسے آن گھیرا تھا۔ نیا بنگلہ لینے آرائش کرنے کے بعد صرف چند لاکھ ہی باقی بچے تھے۔

✲ ✲ ✲

بیرسٹر صاحب کی طرف سے نوٹس آیا تھا۔ وہ حیا کی اجازت کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

کتنی ہی دیر تک اسے یقین ہی نہ آیا۔ وہ بار بار نوٹس کو پڑھتا۔ یہ حیا نے بھیجا ہے؟ حیا میرے ساتھ ایسا کر سکتی ہے۔ نہیں... نہیں... اس نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے آخر اس کی محبت پر اتنا گہرا یقین کیوں تھا۔ اپنے اندر کی اس پکار کو' جذبے کو سمجھنے کی توفیق ہی نہ ہوئی۔

کتنی ہی دیر تک وہ غصے سے ٹہلتا رہا۔

ماہم نے اسے یوں دیکھا تو پریشان ہو گئی۔ اس نے لفافہ اٹھا کر ماہم کو دیا۔

وہ اب پہلے والی زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ انسان کی فطرت ہے۔ جیسے جیسے زندگی کی آسائشات و سہولیات زندگی میں آتی جاتی ہیں۔ وہ غموں کو پچھلی مشکل زندگی کو بھول بیٹھتا ہے۔ وہ بھی بھول گیا۔ زندگی کس مشکل سے کاٹی تھی۔

ماہم کو بھی اپنے خواب چکنا چور ہوتے محسوس ہوئے۔

"مانا کہ میں قانونی طور پر پابند ہوں' مگر یہ میرا حق ہے' میں کسی بھی طرح اپنے حق کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

"آپ نے حیا سے بات کر کے دیکھی ہے۔"

حیا ان کی رقیب تھی۔ دشمن مگر وہ اندر ہی اندر اس سے اتنا مرعوب تھے کہ انصاف کے لیے پھر حیا ہی کو پکارنے کا فیصلہ کر رہے تھے۔ وہ حیا کی اچھائی سے متاثر تھے' مگر مانتے نہیں تھے۔

اس نے سیل اٹھایا۔ حیا کا نمبر ملایا۔ حیا کا دل خوش گمانی سے دھڑکا۔ شاید اسے احساس ہو گیا ہے۔ میری مزاج پرسی کے لیے فون کیا ہے۔

وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ مزاج پرسی نہیں۔ محبت کے پرسے کے لیے کال آئی ہے۔ اس نے بکھرے بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اڑسی۔

"کیسے ہو منتظر' مجھے یقین نہیں آرہا کہ تم نے مجھے فون کیا ہے۔" اس کے لہجے سے خوشی عیاں تھی۔

"تمہارے بغیر بہت اچھا ہوں اور بہت خوش اور یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا کہ تم نے مجھے نوٹس بھیجا ہے۔ جو محبت کے بڑے بڑے دعوے کرتی تھیں۔"

"کون سا نوٹس؟"

"میرا خیال تھا صدمے سے تم مر جاؤ گی۔ مگر نہیں تم کیوں مرو گی' ہو نا حمیرا کی بیٹی... الٹا مجھے پریشرائز کر رہی ہو کہ میں مل کے اپنے ففٹی پرسنٹ شیئرز سے دست بردار ہو جاؤں۔ میں اپنا حق کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ کان کھول کے سن لو۔ تم تمہارا باپ اور تمہاری ڈائن ماں!"

وہ سانس لیے بغیر بولتا گیا۔ وہ بیچ بیچ میں اسے پکارتی رہی۔ "میری بات سنو' میری بات سنو" مگر وہ سننے کے نہیں سنانے کے موڈ میں تھا۔

"تم... تم مجھے کیا نوٹس بھیجو گی۔ میں بھیجوں گا اب تمہیں طلاق نامہ... پھر چھین کے دکھانا تم مجھ سے میرا حصہ... میرے باپ کی جائیداد' میرا حق۔" وہ طیش سے مسلسل بولتا رہا۔

اس کی سماعتوں میں پگھلا سیسہ انڈیل کر وہ سانس لینے کو رکا۔

"نہیں... نہیں... خدا کے لیے مجھ سے اپنا نام مت چھیننا' تم میرے نہیں ہو سکتے تو اپنا نام تو میرے ساتھ رہنے دو۔ مجھے طلاق نہیں چاہیے' نہ میں نے تمہیں کوئی نوٹس بھیجا ہے۔"

وہ رو رو کر تڑپ تڑپ کر گڑگڑا رہی تھی۔

منتظر حسنین کے کلیجے پر ٹھنڈ پڑ گئی۔

وہ اب بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اس کے نام سے بھی اسے محبت ہے۔ وہ اپنا ہر کام با آسانی اس سے نکلوا سکتا تھا۔

✲ ✲ ✲

سیل فون بجا' اسکرین پر حسین رضا کا نام دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ کوندی۔ وہ اب ان سے بات کر سکتا تھا۔ ترپ کا پتا اس کے پاس تھا۔ کھیل جیتنے کی امید' وہ اتنی آسانی سے نہیں ہار سکتا۔ بازی اسی کی تھی' جب تک حیا کی اس سے محبت برقرار تھی۔

"جی فرمائیے... مسٹر حسین رضا!" طنزیہ لہجہ۔

"تمہیں ہمارا قانونی چارہ جوئی کا نوٹس تو مل ہی گیا ہوگا۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"آپ کا خیال ہے میں اس کاغذ کے ٹکڑے سے متاثر ہو جاؤں گا۔"

"یہ محض کاغذ کا ٹکڑا نہیں منتظر حسنین! تمہیں امیر سے فقیر' محل سے جھونپڑے تک لانے والا نسخہ کیمیا ہے۔" حسین رضا نے معتدل لہجے میں کہا۔

"آپ کے اس نسخہ کیمیا سے مٹی ہی نکلے گی۔ سونا نہیں حسین رضا!"

اس کے مضبوط لہجے پر وہ تھوڑا گڑبڑائے۔ مگر کامیاب بزنس مین تھے۔ فوراً" سنبھلے۔ "ہاں سونا بھی نکل سکتا ہے تمہارے لیے۔ اگر تم مجھ سے اک معاہدہ کر لو' مل آدھی نہیں پوری تمہارے نام کر دوں گا۔" حسین رضا نے دانہ ڈالا۔

وہ فوراً" مستعد ہوا۔ "کیا مطلب؟"

"دیکھو بہت آسان بات ہے' یا تو پرانی رنجشوں کو بھلا کر حیا کے ساتھ اپنی خوش حال زندگی گزارو۔"

"ناممکن۔" وہ پُرزور انداز میں انکاری ہوا۔ "وہ میرے سامنے آتی ہے تو مجھے اپنے مظلوم ماں' باپ یاد آجاتے ہیں۔" وہ قطعی لہجے میں بولا۔

"تو پھر دوسرا راستہ ہے۔ تم اسے طلاق دے دو۔ صرف اتنی احتیاط کرنی ہوگی کہ اسے یہ احساس نہ ہو کہ

ہم نے کہا ہے۔ میں مل تمہارے نام کروں گا۔"

"قطعاً" نہیں۔ آپ کی بیٹی میرے انتقام کی تسکین ہے۔ میں اسے کسی حال میں آزاد نہیں کروں گا۔ وہ میرے پاس آپ کے جرائم کی قیدی اور آپ کے گناہوں کی سزا کے طور پر رہے گی۔" اس نے کال کاٹ دی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

وہ سونے کی چڑیا ابھی اس کے ہاتھوں سے نہیں اڑی تھی۔ اس کی محبت کے پنجرے میں قید تھی۔

☼ ☼ ☼

ورق ورق پر تیری عبارت' تیرا فسانہ تیری حکایت
کتاب ہستی جہاں سے کھولی تیری ہی یادوں کا باب نکلا

پورے تین ماہ ہوگئے اسے اک نظر دیکھے ہوئے۔ ان تین ماہ میں سیکڑوں بار وہ اسے "آئی مس یو" کے میسجز کر چکی تھی۔ کتنی بار دل مضطرب کے اضطراب سے گھبرا کر اسے کال کی مگر وہ ریسیو ہی نہیں کرتا۔

نئے نمبروں سے کال کرتی تو اس کی آواز سن کر موبائل آف کر دیتا۔

وہ جھلس گئی تھی اس کے عشق میں' مر رہی تھی' پل پل۔ اک بار دیکھنے کو تڑپ رہی تھی۔ وہ بہت سادہ لڑکی تھی' کبھی کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ اس کی طرف ہوئی تو ٹوٹ کر ہوئی۔ وہ اس کا دوست بھی تھا۔ دلدار بھی پیار بھی' سرتاج بھی' اس کی ذات پرت در پرت اس سے منسوب' اس کی خوشبو سے معطر' اس کے احساسات کی دلفریبی' وابستگی' دلکشی صرف اسی سے وابستہ' اس کے وجود کے ہر کونے سے وہ نکلتا' ہر گوشے میں وہ موجود۔

وہ کیسے رہ پائے گی اس کے بغیر' اس کے بغیر رہنے کا سوچتی تو سانس رکنے لگتی۔ کئی کئی لمحے کے لیے روٹھ جاتی۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی' زندگی کو منانے لگتی۔ اس کی آس دلاتی' اس کو یاد کرتی' اسے کسی سے یوں اتنی اور ایسی شدید محبت ہوگی۔ یہ بات شاید کبھی اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھی۔

ٹوٹ کر چاہنے میں وہ کس کس طرح سے نہیں ٹوٹ رہی تھی۔ ذات کے ٹکڑے یکجا کرتی' پھر اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی' طعنوں' بے اعتنائی سے ریزہ ریزہ ہوتی۔ ریزے نہیں جڑتے۔ مگر وہ جوڑ لیتی۔ پھر ٹوٹنے بکھرنے کے لیے۔

وہ کیسے یار مناتی' محبوب کو راضی کرتی' راضی کرنے کا ہر جتن بے وزن' ہر منت بے توجہ' محبت جو ان کے وجودوں میں ڈھل کر ذات کا حصہ تھی۔ وہ اس کی ذات کا تو حصہ رہی' مگر منتظر کے وجود سے ایسے ڈھل گئی کہ کوئی نشان شائبہ دھبہ تک نہ رہا۔

وہ سراپا انتقام بن گیا۔ اس کی رگوں میں محبت کے بجائے انتقام دوڑتا' مگر پھر بھی محبوب تھا۔ اب ہجر کا یارانہ تھا۔ اک بار پھر بیرسٹر صاحب آئے تھے۔

"آپ کہہ دیں' وہ خود آجائیں کاغذات لے کر میں سائن کروں گی۔" اس نے ہتھیار پھینک دیے۔

وصل محبوب کی رضا سے ہوتا ہے' زبردستی نہیں حاصل کیا جاسکتا۔

اس نے شہادت کی انگلی کی پشت سے آنکھ سے بہنے والا آنسو پونچھا۔ جو ہزار ضبط کے باوجود بند توڑ بیٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ کیا کہہ رہی ہو بیٹا! اپنے پاؤں پہ آپ کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے آپ کا فیصلہ۔" حسین رضا کی ناشتے کی ٹیبل پر اسے دیکھنے کی خوشی اس کا فیصلہ سن کر ریت میں مل گئی۔

"تم نے اجازت نامہ اور چیک سائن کرنے کے لیے اسے بلوا بھیجا ہے؟" حمیرا نے حیرت سے اس کو دیکھا۔

وہ خاموش تھی۔ اس کے پاس ان کی باتوں کا کوئی بھی جواب نہ تھا۔

"اس کا رویہ' اس کا انتقام کچھ بھی نظر نہیں آرہا

تمہیں۔ اگر تمہاری روش یہی رہی تو سب کچھ کھودو گی۔" حمیرا مسلسل بول رہی تھیں۔

"سب کچھ ہی تو کھو چکی ہوں۔" ناشتا زہر ہوگیا۔ آنسوؤں نے گلا بند کردیا۔

"بیٹا! مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ وہ آپ کو مار رہا ہے۔ جلا رہا ہے آپ کی اتنی محبت' توجہ کے باوجود... وہ آپ کے قابل ہی نہیں۔" حسین رضا نے تحمل سے سمجھانے کی کوشش کی۔

اس کی نظریں کسی غیر مرئی نکتے پر جم گئیں۔

"تم بے وقوف ہو' جو اس کو یوں چیک پر چیک سائن کیے دے رہی ہو۔" حمیرا کو اور طیش آیا۔

"میری عقل' میرا ضمیر یہی کہتا ہے' یہ اس کا حق ہے۔ اس کی ملکیت ہے۔ میں اسے روکنے کی بے وقوفی نہیں کرسکتی۔ مجھے پتا ہے بابا! اپنی ذات کی نفی کرکے حق پر چلنا کانٹوں کا سفر ہے۔ انتقام لینا تو بہت آسان ہے۔ بپھرے سمندری طوفان کی مانند' سب کچھ تہس نہس کرنا' ایثار کے رستے پر چلنا مشکل... دریا کے پانیوں کی طرح ہر جگہ پہنچنا' ہموار زمینوں کے ساتھ گھاٹیوں' کھنڈوں سب ہی کو سیراب کرنا' بہت مشکل ہے بابا! بہت مشکل۔"

وہ پور پور بھیگی' آنسوؤں میں ڈوب گئی۔

حسین رضا ہر بات بھول گئے۔ اٹھ کر اسے گلے لگالیا۔

حمیرا کو چپ لگ گئی۔

☼ ☼ ☼

شفق آلود شام کے نیلے افق پر سرمئی بادل پوری آن بان سے دمکتے تھے۔ عقب میں آنکھ چرائے ہوئے نارنجی مائل رنگت سے بکھرے بادل ٹولیوں کی صورت عجب چھب دکھاتے رہے۔

وہ یادِ یار کا کونا پکڑے اس شام کے نظارے میں منہمک رہی۔ آہستہ آہستہ سورج نے رات کا کونا پکڑ لیا اور بادل اس کے ہجر میں سرمئی سے ہلکے سیاہی مائل ہوتے چلے گئے۔ اک تارے نے افق پر نمودار ہو کر بغور اس کو دیکھا۔

وہ بادلوں کی طرح اس کی یاد میں بکھرتی ٹکڑے ٹکڑے ہوتی رہی۔ اس کا وجود' اس کی آواز' کچھ بھی تو نہ تھا۔ بس دل کے اندر یاد تھی۔ جو ساتھ دیتی اس نے کرب سے آنکھیں موندیں۔

وہ سیدھا چلتا ہوا لان میں کھڑی حیا کے مدمقابل آیا۔ اس نے لمبی سانس کھینچ کر آنکھیں کھولیں۔ اس کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر اس کی سانس ساکن ہوئی۔ آنکھ جھپکنے سے انکاری' کہیں خوب صورت سپنا' بھیانک خواب نہ بن جائے۔

"کیوں بلایا ہے؟" چبھتا لہجہ۔

"دیکھنے کو' ملنے کو۔" جواباً اس کے لب ہلے۔

"کیا فرق پڑتا ہے؟" اس کی آنکھوں کی بیگانگی نے لہجے کو بھی تند کردیا۔

"پڑتا ہے فرق... خضر حسنین... یہی تو فرق ہے تم میں' مجھ میں۔ تمہیں سب کچھ نظر آتا ہے۔ مجھے صرف تم' تمہاری نظر ہر کس و ناکس سے نہیں ہٹتی' میری تم سے۔" اس کے لہجے میں صدیوں کی پیاس سمٹ آئی۔

وہ اس کی نظروں سے پگھلنے لگا' مگر اچانک موم سے سیسہ بن گیا۔

"تم میں اور مجھ میں اور بھی بہت سے فرق ہیں۔" وہ طنزیہ انداز میں اپنا اور اس کا تقابلی جائزہ لینے لگا۔

بس اس نے اس کے دل کو ہی نہیں دیکھا۔ سب سے زیادہ خوب صورت' منفرد' محبت کرنے والا' چاہت رکھنے والا دل۔ ایسا دل ہر ایک کو تو ودیعت نہیں ہوتا۔

اس کی آنکھوں میں برسات امڈ آئی۔

"تم اگر محبت کرتی ہو تو کرتی رہو" بے نیاز لہجہ "مگر میری طلب سے باز آجاؤ۔ میں روز' روز تمہاری خواہش پر نہیں آسکتا۔" دھمکی آمیز لہجہ۔

"طلب ختم تو قصہ زندگی ختم خضر حسنین! طلب ہی تو زندہ رکھتی ہے۔ طلب کے بغیر کچھ نہیں۔ طلب مفاد نہیں' بلکہ ہر مفاد سے بچاتی ہے۔ طلب تو ہر عشق کا زیور ہے۔ مجازی ہو یا حقیقی۔ طلب ہی تو پہاڑوں سے نہر کھدوائے' بے آب و گیاہ صحراؤں میں دربدر پھرائے' طلب کے بغیر تو خدا بھی نہیں ملتا۔ طلب میں کتنے لوگوں نے عمریں مٹی میں رول دیں۔ یہ میرے اختیار سے باہر کا معاملہ ہے خضر حسنین۔"

وہ آگے گلا رندھ جانے کی وجہ سے اک لفظ بھی نہ بول پائی۔

"تم اپنا یہ بے کار کا فلسفہ اپنے پاس رکھو۔ مجھ سے بھول کر بھی توقع نہ رکھنا' میں قاصر ہوں' تمہاری کوئی بھی خواہش پوری کرنے سے۔" وہ اس کے مدمقابل آکر... آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے رحمی سے غرایا۔

آنسوؤں کے ریلے میں اس کا عکس دھندلا گیا۔

اس نے فائل کھول کر اس کے سامنے رکھی۔ دوسرے ہاتھ سے جیب سے پین نکال کر اسے تھمایا۔

اس نے مردہ ہوتے وجود سے جدائی کے پروانے پر خاموشی سے سائن کردیے۔ سارے ہتھیار پھینک کر ہار مان لی۔ سلطنت سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

اس نے چیک آگے کردیا۔

حیا نے خاموشی سے سائن کردیا۔

وہ فاتح اسی بے نیازی سے مڑا اور چلا گیا۔ وہ مفتوح وہیں بیٹھی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ خوش تھی۔ سارے معاملات خوش اسلوبی سے طے ہوگئے۔ اس کو اپنے خوابوں کا شہزادہ مل رہا تھا۔ سپنے یوں بھی تعبیر پاتے ہیں۔ دعائیں یوں بھی قبول ہوتی ہیں۔

ماہم بار بار اللہ کا شکر ادا کرتی کہ اللہ نے اسے من پسند ہم سفر عطا کیا ہے۔ اللہ نے کتنا خوب صورت نعم البدل دیا تھا۔ اس کی منگنی خالہ زاد سے ٹوٹی تو سالوں تک غم منایا دل نے بھی اور ماں نے بھی۔

جس رات یہ قیامت خیز خبر ان تک پہنچی' وہ ساری رات اس کا تکیہ بھیگتا رہا۔ ماں نے کروٹیں بدل بدل کر رات کاٹی۔ اپنی کم مائیگی غربت کا احساس اسے مارے دیتا تھا۔ حیا اپنے والدین کے گناہوں میں گھر گئی اور خضر حسنین اس کی طرف مائل ہوتا چلا گیا۔ جستجو نے اسے خضر تک پہنچایا۔ نصیب نے خضر سے ملا دیا۔

اس نے جی بھر کر خضر کے ساتھ شاپنگ کی مشہور ڈیزائنر سے کپڑے بنوائے۔ جیولری خریدی۔ صورت تو اللہ نے اچھی دی تھی۔ زیب و زینت نے حسین تر بنادیا۔

☼ ☼ ☼

اس تقریب میں خضر نے اپنی ساری ایلیٹ کلاس کو مدعو کیا۔

چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں' یہی تو وہ چاہتا تھا کہ لوگ ان پر ہنسیں' حسین رضا کا سگا بھتیجا تھا پھر ایسا کیا ہوا۔ ماضی کی کہانی زبان زد عام بن چکی تھی۔ وہ ان کی سبکی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

"شاندار جوڑی۔" جو بھی دیکھتا کہے بنا نہ رہ پاتا۔ وہ خوب صورت تو تھی مگر عمدہ لباس' جیولری اور میک اپ نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔

اسے پتا تھا' آج اس کے دشمنوں کے سینوں پر سانپ لوٹتے ہوں گے۔ اس نے انویٹیشن کارڈ حیا کو بھی بھیجا تھا' اور مہرین کو بھی۔ اسے اک بار بھی حیا کا خیال نہیں آیا تھا۔ نہ اس کی محبت نہ عنایت نہ مہربانی' حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس بہت سارے پتے تھے۔ مگر وہ تو تب کارگر ہوتے جب وہ کھیلنے کو تیار ہوتی۔ اس نے تو کھیلنے سے پہلے ہی ہار مان لی تھی۔ سارے پتے پھینک دیے تھے۔

وہ جتنا فائدہ اٹھا سکتا تھا' اٹھا رہا تھا۔ اس کی محبت و نرمی سے بیس کروڑ کا بھاری چیک لکھوالیا تھا۔ مبادا وہ بعد میں سوتن کے جلاپے' حسد میں سائن نہ کرے' اور اگر وہ سائن نہ کرتی تو وہ ایک روپیہ بھی نہیں نکلوا سکتا تھا۔

وہ چاہتی تو کئی قانونی رکاوٹیں ڈال کر مل کو تالے لگوا دیتی مگر ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔

ماہم کے ساتھ و سنگت میں حیا اس کو بھول کر بھی یاد نہ آئی۔

اتنی خوب صورت شریک حیات پاکر یا انتقام کی آخری اسٹیج پر پہنچ کر اپنی کیفیات کو وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

☼ ☼ ☼

دعوت نامہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

"تو حیا حسین۔۔۔ آج اس نے اپنی زندگی سے تمہیں مکمل طور پر نکال دیا۔" ایک بار پھر اسے رونے کا دورہ پڑا۔

وہ سارا دن بچھڑے یار کے ہجر کا ماتم کرتی رہی نہ کھانا نہ پینا' کچھ بھی تو یاد نہ تھا اسے۔

دل کی کیفیت عجیب ہوگئی تھی۔ کبھی تیز تیز دھڑکنے لگتا اتنا تیز کہ اس دھڑکن کی پکار ناقابل برداشت ہو جاتی۔ اور کبھی اتنا مدھم ہو جاتا کہ دھڑکنیں محبوب کی طرح گم ہونے لگتیں' وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

مہرین اس کا غم بانٹنے آئی تو اسے بہت بری حالت میں دیکھا۔

"کیوں غم منا رہی ہو' اس احسان فراموش کا جس نے تمہیں سوائے دکھ کے کچھ بھی نہ دیا۔"

اس نے حیا کو بازو سے اپنے قریب کیا۔ اس کا سر اپنے شانے پر رکھ کر تھپکنے لگی' وہ ہمدردی پاکر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"مہرین! اسے صرف لینا آتا ہے' دینا نہیں۔ وہ سمجھتا ہے' محبت کے قابل صرف وہ ہے' نیک' پاک' پارسا' اچھا انسان بھی خود کو ہی سمجھتا ہے۔" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"مگر اس میں قصور اس کا نہیں میری محبت کا ہے' جس نے اس کو آسمان پر بٹھا دیا۔ کہ وہ جھک کر زمین کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔"

"اس لیے حیا کہ وہ خود غرض ہے۔ محسن کش ہے جس نے اسے محبت کے ذائقے سے آشنا کر دیا۔ دھتکارتا ہے اسے' جس نے ہر طبقاتی فرق کو مٹا کر اسے اپنایا۔" مہرین کے لہجے میں دکھ' تاسف' غصہ کیا کچھ نہ تھا۔

"وہ مجھے میرے ناکردہ گناہوں کی سزا دیتے ایک بار بھی نہیں سوچتا کہ میں نے اس کی پرستش کی ہے۔ چاہا ہے محبت کی آخری حدوں تک' اپنے وجود کو مٹا کر۔"

خاموش آنسو اس کے لفظ لفظ پہ گرتے رہے "مجھے تو ایسا لگتا تھا جیسے وہ تم سے محبت کرتا ہو۔"

"نہیں مہرین! اسے صرف وقتی لگاؤ پیدا ہوا تھا۔ میری بے تحاشا محبت' بے انتہا۔ توجہ' بے انتہا آسائشات دیکھ کر وہ محبت کے ہنر سے ناآشنا تھا' ناآشنا ہے۔"

لفظ ختم ہو گئے تھے۔

جب انسانوں کے اندر لالچ' حسد آجاتا ہے تو انسانیت و محبت کھسکنے لگتی ہے۔ غرض کی پٹی آنکھوں پر بندھ جاتی ہے۔

☼ ☼ ☼

"میں نے آپ کے لیے شامی کباب بنائے ہیں۔ حمید ماموں بتا رہے تھے۔ آپ کو بے حد پسند ہیں۔"

آفس سے لنچ ٹائم پر گھر آیا تو ماہم نے خوش ہو کر بتایا تھا۔

کھانا کھانا اس کے لیے مشکل ہو گیا' اسے حیا کا خیال آیا' وہ اکثر اس کے لیے کچھ نہ کچھ بناتی تھی نوالہ گلے میں اٹک گیا۔

"آئندہ میرے لیے مت بنانا۔" اس نے پلیٹ اپنے آگے سے ہٹائی۔

"ارے کیوں بیٹا! اچھے نہیں بنے کیا۔" خورشید گھبرائی۔

"نہیں خالہ! مجھے شامی کباب سے اس ڈائن کی بیٹی یاد آگئی' اتنی بار اس نے بنا کر کھلائے ہیں کہ اب لگتا ہے۔ ہر جگہ اس نے ہی بنائے ہوں گے میں ان لوگوں کو یاد نہیں کرنا چاہتا' ان کی ہر یاد' ہر بات بھلا دینا چاہتا ہوں۔"

"اوہ۔ اچھا۔ آئندہ میں آپ کے لیے نہیں بناؤں گی۔" ماہم نے جلدی سے پلیٹ اس کے سامنے سے ہٹائی۔

"اچھا۔ یہ مچھلی کھالو۔ بہت مزے کی بنی ہے۔" حمید ماموں نے فرائی مچھلی اس کے آگے رکھتے ہوئے دلجوئی کی۔

ماہم نے سوچا وہ اب کبھی شامی کباب نہیں بنائے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی حیا بھول کر بھی اسے یاد آئے۔

☼ ☼ ☼

"وہ سانپ ہمیں ڈس رہا ہے' ہماری دولت پر عیش کر کے' ہمارے سینے پر مونگ دل رہا ہے۔ اور۔۔۔ تم حسین رضا! خاموش بیٹھے ہو کوئی کارروائی نہیں کر رہے اس کے خلاف۔"

"ہمارے پر کٹ گئے ہیں حمیرا! یہ تم بھول رہی ہو۔"

"تمہیں اس سے ہمدردی ہے' بھائی کا بیٹا ہے نا! باپ بیٹی نے سر پر چڑھا دیا۔ وہ چیک پر چیک سائن کر کے دے رہی ہے۔ تم سے اتنا نہیں ہوتا کہ بینک مینیجر سے کہو کہ اتنے بڑے چیک کیش نہ کرے۔ آخر تم دونوں کو ہو کیا گیا ہے؟" وہ جھنجلائیں۔

"کیا کروں' تم بتاؤ۔" حسین رضا نے اخبار ٹیبل کے کونے پر پٹخا۔

"تمہارے پاس کوئی چال نہیں۔ کوئی کارڈ نہیں تم اتنے بڑے گیم لوزر ہو سکتے ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا۔" وہ طنزیہ طنز کرتی رہیں۔

"ہم ہار گئے ہیں' یہ تم تسلیم کیوں نہیں کر رہیں۔" انہوں نے سگار کا کش لگایا' تھکے تھکے انداز میں چیئر کی بیک سے ٹیک لگائی۔

"تمہارے جیسا کھلاڑی جو زندگی میں کبھی نہیں ہارا' سب کچھ حاصل کر لیا۔" وہ نفی میں سر ہلاتی رہیں۔ "یقین نہیں آتا' مجھے بالکل بھی یقین نہیں آرہا۔" وہ اس کے سامنے والے صوفے پہ آبیٹھیں۔

وہ تلخی سے مسکرائے۔

"یقین تو مجھے بھی نہیں آتا۔" انہوں نے خود کلامی کی۔ "میں اتنا مجبور ہو سکتا ہوں؟ ہمارا تکبر ہمیں لے ڈوبا۔" اس کے لہجے میں تھکن ہی تھکن تھی۔

"کیا کہہ رہے ہو' میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" وہ مضطرب ہو کر ٹہلنے لگیں۔

"حسین رضا! مجھ سے یہ ہار' یہ دکھ برداشت نہیں ہو رہا' دل کر رہا ہے' قتل کر دوں اسے۔" انہوں نے مٹھیاں بھینچیں۔

"اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں اسے مار دوں' اپنی نسل ختم کر دوں' باپ دادا کی پیڑھی ناس کر دوں' گناہ پر گناہ' جرم پر جرم' یہ نہیں ہو گا اب مجھ سے حمیرا بیگم! حیا جو کہتی ہے ٹھیک کہتی ہے' شکر کرو اللہ نے ہمیں اتنی نیک بیٹی دی ہے' جو ہماری غلطیوں کا کفارہ بن رہی ہے' ہمیں غلط فیصلوں سے بچا رہی ہے' اب توبہ کا وقت ہے تم بھی توبہ کر لو تو بہتر۔"

وہ کہتے ہوئے اٹھے۔

باتیں ان کے دل کو بھی لگ رہی تھیں' وہ خاموش رہ گئیں۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"وضو کرنے' دو رکعت نفل توبہ ادا کرنا ہے۔"

حمیرا نے سر جھکا لیا۔

☼ ☼ ☼

وہ اٹھتا تو گڈ مارننگ کا میسج ملتا' سوتا تو گڈ نائٹ کا' اور پھر دن میں چھوٹے چھوٹے محبت بھرے جملے اشعار آتے رہتے۔ یہ حیا کا معمول تھا۔

اور اب وہ اتنا عادی ہو چکا تھا کہ لاشعوری طور پر منتظر رہتا وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا کہ کس جذبے سے مجبور ہو کر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے میسجز پڑھتا تھا۔ البتہ جواب کبھی نہیں دیا تھا۔

ماہم کو اس کے یہ میسجز کھٹکتے' اس نے چپکے سے منتظر کا سیل اٹھایا اور جواب ٹائپ کرنے لگی۔

"آخر تم میسجز کرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں' تمہیں یقین کیوں نہیں آتا کہ میرا اب تم سے کوئی

تعلق نہیں ہے۔ میں تمہیں یاد نہیں کرنا چاہتا' مجھے اپنے ماں باپ کی اذیتیں یاد آئی ہیں' میں تم سے نفرت کرتا ہوں' حیا حسین! میں تم سے شدید نفرت کرتا ہوں' یہ بات مان لو "قاتلہ کی بیٹی قاتلہ۔"

اس نے میسج دو تین بار سینڈ کیا' پھر ڈیلیٹ کرکے سیل اس جگہ پر رکھ دیا۔

"مجھے پتا ہے۔ حیا! تمہارے میسجز ہم دونوں کو ڈسٹرب کردیتے ہیں۔ میں نے جو بھی لکھا وہ میں نے وقتاً" فوقتاً" مختطر کی زبانی اس سے سنا ہے۔" دل کو دلاسا دیا۔

☼ ☼ ☼

تم ہمیں بھول بیٹھو تو ہزاروں پہلو
ہم تمہیں بھول کے بیٹھیں تو کیسے یاد کریں

وہ روتی رہی اس کے اس نفرت انگیز میسج پر اس کو نیند نہیں آرہی تھی' ذرد روئیں روئیں میں سرایت کررہا تھا' وہ بھاگنا چاہتی تھی۔ اس درد سے' وہ خود نجات حاصل کرنا چاہ رہی تھی ان میسجز سے' مگر کہاں جائے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔

وہ گھبرا کر باہر نکلی۔ لان میں آئی۔ حمیرا سر جھکائے وہیں بیٹھی تھیں۔ وہ گہری سوچوں میں گم تھیں۔ آنسوؤں سے ان کا چہرا بھیگ رہا تھا' اس کی ماں یوں رو رہی تھی' جو کٹھور مشہور تھی' یقیناً" اس کا دکھ ہی اس کو رلا رہا تھا۔

"کیوں وہ اپنے ماں باپ سے بدلہ لینے پر تلی ہوئی ہے۔" ایک سوچ نے اس کو جکڑا' انہوں نے کیا کیا ناز نہ اٹھائے' اس کی خوشیوں کے لیے۔ سب کچھ تج کر بیٹھے حتی کہ مختطر کو بھی اپنا لیا اور وہ اس سب کا صلہ نفرت بے اعتنائی' بے رخی کی صورت دے رہی ہے ان کو۔" دل مجرم بنا' ماں باپ کی محبت نے دل میں انگڑائی لی' اس کے احسان یاد آگئے' اپنے رویے پر انتہائی شرمندگی ہوئی۔

بالفرض ان کے ماضی کی یہ سب باتیں سچ بھی ہوں تو بھی مجھے کیا حق پہنچتا ہے' بازپرس کا۔

"میری زندگی تو ان ہی کی وجہ سے تلخ ہوئی۔" اندر کی خود غرضی عود کرو لیل بنی۔

"اور انہوں نے جو اپنی دولت' محبت' شفقت کے خزانے تم پر لٹا دیے۔ وہ کس کھاتے میں ڈالو گی حیا حسین' کوئی ایک حق بھی ادا کیا تم نے؟" ضمیر نے آئینہ دکھایا۔

وہ ٹھٹک گئی' الٹے پاؤں واپس اپنے کمرے میں آئی۔

"ٹھیک ہے' انہوں نے جو بھی کیا' برا کیا۔ وہ اپنے اعمال کے لیے خود ہی جواب دہ ہیں۔ بحیثیت اولاد میں ان سے کس قسم کا انتقام لے رہی ہوں' کیوں.... کیوں میں ان سے اتنی دور ہوگئی' میرا رویہ اتنا خراب کیوں ہے؟"

اندر سے بیک وقت ابھرنے والی آوازوں نے اسے بوکھلا دیا۔

"کیا اللہ مجھے اس بات کی اجازت دیتا ہے؟" اسے خود اپنی سوچ پر حیرت ہوئی۔ اللہ کے احکام کا خیال زندگی بھر نہ کسی نے دلایا' نہ ہی آیا تھا' پھر یہ روشنی کہاں سے آرہی تھی' اس نے بلا ارادہ بے اختیار ہو کر سر اوپر اٹھایا' کمرے میں لگا فانوس عین اس کے اوپر تھا' مگر یہ روشنی اس کی نہ تھی' یہ تو اندر سے پھوٹ کر نکل رہی تھی' اس نے سر جھکا کر آنکھیں بھینچ لیں۔

"یا اللہ مجھے معاف کر' میری غلطیوں سے درگزر فرما۔"

"یا اللہ مجھے معاف کر' اندھیروں سے نکال۔ روشنی دے۔ اندھیروں سے نکال ظلمت سے بچا۔"

دعا مانگتے مانگتے اسے نیند آگئی' ایسا سکون جو کبھی سکون آور گولیوں سے بھی نہ ملا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ صبح اٹھی تو فریش تھی' اس نے پرانے معمول کی

طرح اٹھ کر غسل کیا' ٹھیک آٹھ بجے وہ ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھی۔

حمیرا اور حسین رضا نے ایک دوسرے کو خوش گوار حیرت سے دیکھا۔

"السلام علیکم!" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی طبیعت ہے۔ بیٹا؟" حسین رضا نے پہل کی۔

"پہلے سے کافی بہتر ہوں۔" اس نے باپ کو دیکھ کر کہا۔ پھر مسکرا کر ماں کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آئی خوشی کی نمی کو دیکھ کر اسے اور ندامت ہوئی۔

"آپ کے پاس کتنی دولت ہے؟" اس نے ماں کا دیا ہوا چائے کا کپ تھامتے' باپ سے سوال کیا۔

"کیوں بیٹا! کتنی چاہیے آپ کو؟" حسین رضا خوش دلی سے مسکرائے۔

"نہیں۔ ایسے ہی پوچھ رہی ہوں اندازا" کتنی ہے؟" اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"آپ کے اندازوں سے بڑھ کر بہت زیادہ۔"

"بابا! آپ ایسی جگہ سرمایہ کاری کیوں نہیں کرتے۔ جس میں آپ کو دس فیصد منافع یہاں حاصل ہوجائے اور ستر فیصد سیو ہوجائے۔"

"بالکل لگانے کو تیار ہوں' کس بینک کی پالیسی ہے؟" وہ بے اختیار کہہ گئے۔

حیا مسکرا اٹھی۔ "جنت بینک"

"میں نے تو نہیں سنا۔ نیا کھلا ہے۔"

"حیا بے اختیار کھلکھلا اٹھی۔

"بیٹا! جتنا چاہو سرمایہ لگاؤ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" حمیرا اس کا نقطہ نظر سمجھتے ہوئے خوش دلی سے بول اٹھیں۔ "ہم تو تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں! میں دیہی علاقوں میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ اور تھر میں پانی کی فراہمی کے لیے کچھ کنوئیں وغیرہ کھدوانے کا کام بھی کرنا چاہتی ہوں۔"

"آپ کا جس طرح دل چاہے کریں' پیسے کا مسئلہ نہیں بیٹا! بس آپ خوش رہیں' میں آج ہی آپ کے اکاؤنٹ میں بھاری رقم ٹرانسفر کروا دیتا ہوں۔"

حسین رضا نے اٹھ کر اس کی پیشانی چومی۔

"یہ سب کچھ تمہارا ہے بیٹا! جیسے چاہو خرچ کرو' اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری بچی کو نیک کام کی توفیق دی۔"

حمیرا کی تشکر بھری آواز ابھری۔ وہ دونوں خوش تھے کہ حیا نہ صرف زندگی کی طرف لوٹ آئی ہے۔ بلکہ دوسروں کی زندگی میں خوشیاں بانٹنے کو بھی تیار ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ میرے مقدر میں ہے' اس لحاظ سے میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ میں اس کی ہو کر صرف اس کی رہی' وہ میرا ہو کر میرا نہ رہا۔

میں بازار محبت میں بے مول بک گئی' اور وہ کیسا خریدار ہے۔ جو نہ دل' نہ حسن' نہ پیار کسی کا بھی سودا نہیں کرتا۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہا ہے۔ اور میں بچانا چاہتی ہوں اسے' اس آگ سے' اس انتقام سے' میں جانتی ہوں' اسے کچھ نہیں ملے گا' وہ صرف اپنا دامن جلائے گا' اگر وہ اس انتقام سے مجھ سے نفرت کرکے خوش رہ سکتا تو مجھے اس کی نفرت بھی قبول ہوتی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ہاتھ میسج ٹائپ کرنے لگے۔

"میں تیری سودائی محبت کی ماری' تیرا من اگر مجھے انتقام کی آگ میں جلا کر خوش ہوتا ہے' تو مجھے جلا کر خاکستر کردے' بھسم کردے' راکھ بنا دے' آگ لگا دے آگ.....'"

میسج سینڈ کرکے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☼ ☼ ☼

اس کے خیال خانہ بدوشوں کی طرح مسلسل مسافرت کا عذاب بھگتتے' کبھی دل کے کوچے میں ٹھہرتے' کبھی ذہن کے قریے میں ٹہلتے' کبھی غم جاناں میں گھلتے' کبھی فکر دوراں میں جا رکتے' چلنے' رکنے' گھٹنے' بڑھنے کا سلسلہ بدستور جاری رہتا۔

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اداسیوں کے گہرے سمندر موجزن رہتے۔ اس سانولی رنگت میں عجیب سی کشش پیدا ہوگئی تھی' دیکھنے والے اک نگاہ ڈالنے کے بعد دوسری نگاہ ڈالنے سے خود کو روک نہ پاتے۔

"آج گھر پر رہنا' چیک سائن کروانا ہے' اس دن بھی آیا تو تم نہیں تھیں۔" منتظر نے میسج کیا۔

وہ آیا تو اس کو پہلے سے بھی جاذب نظر لگا' یقیناً بہت خوش تھا۔ اس کی سنگت اس کو وہ خوشی نہ دے سکی جو ماہم کے ساتھ نے دی تھی۔ دل میں درد کی لہر اٹھی تھی۔ وہ اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"چائے پئیں گے؟" شاید کچھ دیر بیٹھ کر دو باتیں کرلے۔ وہ گھڑی کے لیے رک جائے۔ دل نے راہ دکھائی وہ مجبور ہو گئی۔

"نہیں۔" اس نے رکھائی سے انکار کیا' اسے اسی جواب کی امید تھی۔

"کیوں! زہر دینا ہے؟" لہجے میں طنز کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا' وہ حسب عادت کوئی موقع ضائع نہیں کرہا تھا۔

وہ اس کے اس طنز کو بھی حسب معمول درد کے تبسم سے پی گئی۔

"اللہ آپ کو زندگی دے ہمیشہ خوش رکھے۔" دعائیہ الفاظ اس کے لبوں سے ادا ہوئے۔

"خوش تو میں ہوں بہت زیادہ' ماہم سے شادی کے بعد مجھے حقیقی خوشیوں کا احساس ہوا ہے بہت خیال رکھتی ہے وہ میرا۔ میں بھی ٹوٹ کر چاہتا ہوں اسے۔"

وہ اسے کیا باور کرانا چاہتا ہے' وہ سمجھ گئی۔ وہ اسے جلانا چاہتا ہے' ماہم کا ذکر کرکے وہ پر سکون سامع بنی رہی۔

"تم کیا جانو منتظر حسنین' اسے حسد کی آگ کیا جلائے گی' جو محبت کے بھانبڑ میں جلے ہجر کی تپش میں تڑپے۔"

وہ اک لمحے کو اس جواب اور وہ بھی غیر متوقع پر چپ رہ گیا' مگر پھر سے ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں کود پڑا۔

"اوہ تمہیں برا لگ رہا ہے ماہم کا ذکر۔ صحیح ہے بھئی برا تو لگے گا' آخر ایک کمی کمین تمہارے باپ کے قیدی کی بیٹی تمہارے برابر آگئی۔ اُفوہ برابر نہیں۔ تم سے اونچی مسند پر جا بیٹھی' میرے دل کی حکمران' گھر کی ملکہ' وجود کی مالکن۔"

وہ اپنے تئیں تاک تاک کر نشانے باندھ رہا تھا۔ اسے زخمی کرنے کا یہ نادر موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

"میں مانتی ہوں منتظر حسنین! محبت میں رقابت کا جذبہ شدید ہوتا ہے۔" وہ اس کے لہجے پر یکدم خوش ہوا کہ اس کی چوٹیں ناکام نہیں ہوئیں۔

"مگر تم تو میرے تھے ہی نہیں' کوئی امید' کوئی وابستگی' کوئی دلبستگی کا شائبہ تک نہ تھا' دامن دل میں۔ میں نے تو یک طرفہ محبت کی۔ اور یہ محبت میرے لیے آگ بنی یا گلزار' میرا نصیب' کسی کا اس سے کیا تعلق۔"

اس کے نپے تلے انداز نے اسے لاجواب کردیا۔ اس نے چیک بک آگے بڑھائی۔

حیا نے حسب معمول خاموشی سے دستخط کردیے۔

"تم سمجھ رہی ہوگی کہ میں نے اتنی بھاری رقم کا چیک کیوں سائن کروایا ہے' تو سنو' میں بار بار تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا' اس لیے۔"

"آئندہ چیک بھیج دینا' میں نہیں چاہتی' تم اس اذیت سے بار بار گزرو۔" اس نے ٹوٹے وجود کو مضبوط لہجے سے سنبھالا دیا۔

جواب پھر غیر متوقع' آج وہ اسے لاجواب کرنے کا تہیہ کیے بیٹھی تھی شاید اس کے سارے نشانے چوک رہے تھے۔

"شکریہ تمہارا۔" لہجہ طنزیہ ضرور تھا' مگر آگے وہ کچھ بھی بول نہ پایا۔ چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ وہ اٹھا اور جانے لگا۔

"اللہ کی امان میں' منتظر حسنین!"

وہ ٹھٹکا' رکا' مڑ کر اسے دیکھا' اس کی نظروں میں ناسمجھ میں آنے والی حیرت تھی۔ پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

حیا نے آنکھیں موند کر تھکے 'ہارے ہوئے انداز میں سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر آیا تو حمید ماموں نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ ڈالا۔

"بہت مبارک ہو بیٹا!"

"کس بات کی ماموں؟"

"ارے ملکوں کی پیڑھی آگے بڑھنے والی ہے تیرا وارث پیدا ہونے والا ہے پتر!" وہ ہاتھ اٹھا کر ناچنے لگا۔

"خیر مبارک ماموں! آپ کو بھی مبارک ہو۔"

وہ صبح آفس گیا' تو ماہم کو ہلکی سی حرارت تھی' اس نے ناشتا بھی نہیں کیا' متلی ہو رہی تھی۔

"میں آؤں گا تب تک شام ہو جائے گی۔ گاڑی بھیج دیتا ہوں' خالہ کے ساتھ جا کر ابھی چیک اپ کروالو۔" اس نے جاتے ہوئے تاکید کی تھی۔

وہ خوش ہو کر کمرے میں آیا۔

"مبارک ہو میرے بچے کی اماں جان!" وہ مسکرایا۔

ماہم کھلکھلا کر ہنسی۔ "بچے کے ابا جان کو بھی مبارک ہو۔"

"ڈاکٹر نے پھر کتنے دنوں بعد چیک اپ کروانے کو کہا ہے۔"

"ہر ماہ وزٹ ہو گا۔"

"نہیں یار! ہم ہر پندرہ دن بعد وزٹ کریں گے۔ میں چاہتا ہوں میرا بچہ خوب صحت مند ہو۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

وہ اپنی اس خوشی میں ایسا مگن ہوا کہ بھول کر بھی حیا اسے یاد نہ آئی' نفرت سے ہی سہی۔ ماہم کا چیک اپ' کھانے کا خیال' ٹائم سے دوائیوں کا خیال' اتنی محبت توجہ پر ماہم فضاؤں میں اڑتا محسوس کرتی خود کو۔ جیسے جیسے ڈلیوری کے دن قریب آرہے تھے' وہ ڈر رہی تھی۔

وہ اس کی ڈھارس بندھاتا' "سب خیریت سے ہو جائے گا' تم پریشان نہ ہو۔"

خالہ اور اماں ہمت دلاتیں۔ "ارے بیٹا! کیوں اتنا ڈر رہی ہو' کچھ نہیں ہو گا۔ یہ دنیا کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہے گا' اک تم ہی تو اکیلی نہیں۔" وہ اس پر ہنستیں۔ پھر دعائیں دیتیں۔

"اللہ آسانی دے گا۔"

یہ نو ماہ ان کے اتنے محبت بھرے اور مصروف گزرے کہ بھول کر بھی ان لوگوں کا ذکر ان کی زبان پر نہ آتا۔

☼ ☼ ☼

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں۔
تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اس کا دل آشیانہ حزیں' جہاں دل نو' دلبر کی دلبری کی ابر باراں نہیں برستی' برق ناقدری گرتی' وہ اس برق میں جل کر بھسم ہو جاتی۔

رات تیسرے پہر میں داخل ہوئی' جب خضر کا نام موبائل اسکرین پر جگمگانے لگا' اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ معجزہ کیسے ہو گیا۔

"میرے دشمنوں کو خبر ہو کہ اللہ نے مجھے بیٹی سے نوازا ہے۔"

اس نے فوراً جواب دیا۔

"اس رحمت کے لیے آپ کو ڈھیروں مبارک باد۔"

"اس نے اس قابل تو سمجھا کہ اپنی خوشیوں میں شریک کیا۔" دل نے خوشی محسوس کی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کے دل جلے میسج نے اس تاثر کو زائل کر دیا۔

"ہاہاہا! بہت دکھ ہوا ہو گا تمہیں' میری وارث پیدا ہو گئی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ قاتل کی اولاد کے بطن سے نہیں محسن کی اولاد کے بطن سے۔ ماہم سے جو میری جان ہے۔"

اس کے ہاتھ تیزی سے جواب ٹائپ کرنے لگے۔

"محبت نفع و نقصان کی جمع تفریق نہیں دیکھتی۔ بے غرض ہوتی ہے۔ دل کرائے کا گھر نہیں صاحب! اس کے مکین بار بار نہیں بدلتے۔"

اس کے آنسو موبائل اسکرین پر گرے' اس نے پیغام ارسال کر دیا۔

محبت ایسی ہی ہے۔ جبر بن کر نازل ہونے والی۔ صبر بن کر سہنے والی' ہجر کا قہر بن کر جلانے والی' دراصل وہ جس کو محبوب کی گلی سمجھی تھی۔ وہ محبوب بھی اک ادنیٰ و فانی انسان اور وہ گلی بھی بھول بھلیاں' جس میں وہ گم ہو گئی۔ اسے ادراک ہوا کہ اس نے غلط راستہ پر قدم رکھا تھا۔

"الٰہی مجھے اپنا راستہ دکھا دے۔ مجھے انسان کے پیچھے دوڑنے کی رسوائی سے بچا' میں فون کرتی ہوں' وہ نہیں اٹھاتا' وہ میری پکار کا جواب نہیں دیتا۔ مگر۔۔۔ مگر تو۔۔۔ تو مایوس نہیں کرتا' ہر پکارنے والے کو جواب دیتا ہے' مدد کرتا ہے' جو تجھے چھوڑ جائے اسے بھی اپناتا ہے تو مجھے فانی کے عشق سے بچا دے' نکال دے۔ مجھے باقی کا عشق عطا کر۔"

صرف وہی نہیں سلگ رہی تھی۔ رات بھی ساتھ ساتھ سلگتی تھی۔ اس کا چہرہ بھیگ گیا۔ یہ پہلی بار ہوا کہ وہ رب صمد جو بے نیاز تھا۔ اس سے ہم کلام تھی۔ جب بے بس ہوئی تو اس صمد' بے نیاز رب کو پکارنے لگی' جس سے مخلوق کتنی ہی بے نیاز ہو جائے۔ وہ پکارنے والے کی پکار سنتا ہے۔

اسے یہ ادراک بہت دیر میں ہوا کہ محبوب ہمیشہ بے نیاز ہوتا ہے۔ مگر رب صمد ایسا بے نیاز ہے کہ جس کے سامنے اک بار نیاز سے عاجزی سے بندہ جھک جائے' تو وہ کہتا ہے "تم ایک قدم بڑھاؤ' میں دس قدم بڑھاؤں گا۔"

اس کے دل پر آہستہ آہستہ سکون اترنے لگا۔ اس کا دل بارگاہ ایزدی میں جھکنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسپتال کے کمرے میں وہ سب خوش تھے۔ ماہم کو ہوش آگیا تھا۔

سب اس کو مبارک باد دے رہے تھے۔ اس کا خیال رکھ رہے تھے۔

"جس گھر میں پہلوٹی کی اولاد بیٹی ہو' اس گھر میں فرشتے مبارک باد دینے آتے ہیں۔" خالہ نے اس کی پیشانی چومتے کہا۔

"ہم اس کا نام مریم فاطمہ رکھیں گے' مرحومہ زبیدہ بہن کو بڑا پسند تھا۔ خضر کی باری بھی کہا تھا کہ اگر بیٹی ہوئی تو مریم ہی نام رکھوں گی۔" حمید ماموں' بہن کو یاد کر کے بولے۔

"اگر اماں کو یہ نام پسند تھا' تو میں یہی رکھوں گا۔" خضر نے بیٹی کو سینے سے لگا کر کہا۔

"ہاں ہاں ضرور بیٹا! کیوں نہیں۔" ساس نے خوش ہو کر کہا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

"میں دیکھتا ہوں' کوئی ڈاکٹر یا نرس ہی ہو گی۔"

بخشل نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ "جی یہ خضر صاحب کے لیے۔" ڈرائیور اسے باہر سے ہی تھما کر واپس چلا گیا۔

"ارے بیٹا! یہ تمہارے نام کوئی دے گیا ہے' پھولوں کا گلدستہ' مٹھائی کا ٹوکرا۔ اس کے اوپر رکھا کارڈ۔"

"کس نے بھیجا ہے؟" حمید نے اس سے لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"یہ پوچھنے کا اس آدمی نے موقع ہی نہیں دیا۔ بس خضر میاں کا پوچھا۔ میں نے کہا اندر ہیں۔ یہ تھمایا اور یہ جا وہ جا۔"

"ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" خضر نے کارڈ کھولتے ہوئے کہا۔

بے حد مبارک باد کے ساتھ بیٹی کے جنم پر میری طرف سے یہ تحفہ' امید ہے پسند آئے گا۔
تمہاری حیا خضر حسنین۔

اس نے بلند آواز سے پڑھا۔

ماہم کو اچانک بے چینی نے آن گھیرا' دل زور زور

سے دھڑکنے لگا۔

"تحفہ یہ مٹھائی ہے۔" بخشل استہزائیہ ہنسا۔

"نہیں۔پاور آف اٹارنی' مل میں اپنا حصہ بھی میرے نام کردیا ہے۔" لیٹر ہاتھ میں پکڑ کر لہرایا۔

منتظر کے چہرے پر حیرت تھی۔ جو اس کے لہجے سے بھی جھلکتی تھی۔ رات میں نے طعنہ دیا تھا۔ شاید وہ اس طعنے کو غلط ثابت کرنا چاہتی ہے۔ مکار' سمجھتی ہے مجھے جیت لے گی۔ اپنے ان ہتھکنڈوں سے۔"

"ارے بیٹا! اس نے جو بھی کیا' تمہارے حق میں تو اچھا ہی ہوا۔ اب تمہیں چیک سائن کروانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سمجھو' مالک ہو اب تم۔" حمید نے کہہ کر شانہ تھپتھپایا۔

"ارے ہماری ننھی پری بھاگوان ثابت ہوئی ہے۔ آتے ہی رحمت کے دروازے کھول دیے ہیں۔" بخشل نے چہک کر کہا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بالکل۔" سب تائید کرنے لگے۔

"خالہ! یہ مٹھائی اسپتال کے عملے کو دے دینا۔" منتظر نے ٹوکرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

صالحہ خاتون نے تسبیح پڑھتے ہوئے صرف اثبات میں سر کو جنبش دی۔

ماہم کے سر سے بوجھ اتر گیا۔ وہ اسی کا تھا۔ اب تو اس کا قلعہ اولاد نے اور بھی مضبوط کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

محبت کی عادات ہر ذی روح کے احساسات سے مختلف ہیں' انسان دام الفت کا شکار' محبوب کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے۔ چاہے محبوب چاہے یا نہ چاہے۔ مگر محبوب کی دھتکار میں بھی عجب اک پکار پوشیدہ رہتی ہے۔

محبوب کا انکار' اقرار' نفی' اثبات' جھڑکنا' بلانے کے مترادف' دل کے جذبات ذہن کے احساسات پر صرف محبت کا سکہ رائج رہتا ہے اور محبت میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب قربت اور فرقت بے معنی ہوجاتی ہے۔ محبت کرنے والے ایک جاوداں لمحہ میں قید ہوجاتے ہیں۔

عید آنے والی تھی۔ اس نے اپنی اسسٹنٹ کو ان اداروں کی لسٹ بنانے کو کہا' جہاں یتیم بچوں کی پرورش ہوتی تھی۔ اس نے اس عید پر ان بچوں کو کپڑے' جوتے' دینے کا پروگرام بنایا تھا۔

اس کی این جی او کے ساتھ ایک میٹنگ تھی۔ جو غریب' ذہین بچیوں کو اسکالر شپ پروگرام دے رہی تھی۔ ان کے فائنانشل پروگرام کو وہ سپورٹ کررہی تھی۔

"بیٹا! آپ خود کیوں نہیں این جی او بنالیتیں۔" اک روز حسین رضا نے اس کو مشورہ دیا۔

"میں۔۔۔ تنہا اتنا کام سنبھال سکتی ہوں بابا؟" اس نے الٹا سوال داغا۔

"ہم کاموں کے لیے ورکرز رکھیں گے۔ آپ صرف نگرانی کریں گی' اچھا ہے' اس سے' کچھ لوگوں کو روزگار بھی مل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے بابا۔۔۔ جیسے آپ چاہیں' مگر ایک شرط ہے' جن تنظیموں سے میں وعدہ کرچکی ہوں' فنڈنگ کا وہ میں پورا کروں گی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں بیٹا! آپ ان کے ساتھ تعاون کرنا چاہتی ہیں' تو کرتی رہیں؟ یہ کام ہم الگ کرلیں گے۔"

کچھ ہی دنوں میں حسین رضا نے نہ صرف حیا فاؤنڈیشن رجسٹر کروالی تھی۔ آفس بھی بنوالیا اور ساری آسامیوں پر مختلف ورکرز بھی رکھ لیے۔

اس کے لیے کام بہت آسان ہوگیا تھا۔

گوٹھوں' دیہاتوں میں غربت کا تناسب بہت زیادہ تھا۔ اس کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ لوگوں کی مفلوک الحالی اور غربت' تنگ دستی دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو روتا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے ان کی مدد کرنا چاہتی۔

اپنا غم ان کے غموں کے آگے ہلکا پڑ جاتا۔ اپنا درد ان غریبوں کے درد و دکھ کے سامنے بے معنی لگتا۔ وہ وقتی طور پر ہی سہی' مگر بہل جاتی۔

☼ ☼ ☼

"آج مریم کے اسکول کا پہلا دن ہے۔" ماہم نے منتظر کو اطلاع دی' جو بیرون ملک دورے سے رات دیر سے آیا تھا۔

"اچھا۔۔۔ ایڈمیشن ہوگیا اس کا؟" اس نے ناشتہ کرتے ہوئے کہا۔

"ارے بیٹا! بچی روئے گی' آج تم خود چلی جاؤ اس کے ساتھ۔" صالحہ خاتون کوئی دسویں بار یہ کہہ چکی تھیں۔

"خالہ! آپ کیوں پریشان ہورہی ہیں۔ ساری دنیا کے بچے اسکول جاتے ہیں۔ سیٹ ہوجائے گی۔" ماہم نے ہنستے ہوئے دلاسا دیا۔

"تو یہ تو تمہارے ساتھ بھی اک ماہ تک خود اسکول گئیں۔ کہیں ماہم کی' کوئی بچہ پٹائی نہ کردے۔" خورشید نے بچپن کی بات بتا کر نواسی کی پیشانی چومی۔

"خالہ تو ہمیشہ سے ہی ایسی ہیں اماں' مگر اب آپ بھی بالکل ایسی ہی ہوگئی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہونے والی۔"

"ہاں تو بیٹا۔۔۔ اصل سے سود عزیز ہوتا ہے۔ تمہاری بچی میں تو ہماری جان ہے۔" خورشید کی تائید سب نے کی۔

"ہاں تو چلی جاؤ نا خالہ صحیح کہہ رہی ہیں۔ بچی ہے' فرسٹ ڈے پر تم ساتھ رہو گی' تو نارمل بی ہیو کرے گی۔" منتظر نے بھی تائید کی۔

"اوکے۔۔۔ آپ مجھے ڈراپ کردیں گے؟" اس نے استفسار کیا۔

"شیور!" منتظر مسکرایا۔

مریم فاطمہ اسکول ڈریس پہن کر رانی بنی بیٹھی تھی۔ سب کے درمیان۔

☼ ☼ ☼

بہت دنوں بعد مہرین سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ دل کھول کر اس سے باتیں کررہی تھی۔ اپنے سوشل پروگرامز کے بارے میں بتاتے اس کے چہرے پر انوکھی سی خوشی تھی۔

"میں نے اتنے سالوں میں یہ اندازہ لگایا ہے کہ ہم اپنے سارے مسائل' غربت' لسانیت' دہشت گردی سب پر' کنٹرول کرسکتے ہیں۔ اگر لٹریسی ریٹ بڑھ جائے۔ خواندگی کی شرح بڑھنے کے ساتھ مسائل کسی حد تک کم ہوسکتے ہیں' شعور کی بلوغت لوگوں کو انصاف کرنا سکھائے گی اور حق پر چلنا' اپنے مسائل کو حل کرنا سکھائے گی۔"

وہ روانی سے بول رہی تھی۔ جب اچانک اس نے دانت بھینچے' دونوں ہونٹوں کے درمیان "سی" کی آواز نکلی' چہرے پر اچانک تکلیف کے آثار نمایاں ہوگئے۔

"کیا ہوا؟" مہرین نے فوراً آئس کریم کپ ٹیبل پر رکھتے کہا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے آنکھیں نیم وا کرکے نفی میں سر کو جنبش دی' بھینچ کے لمبی سانس لی۔

"کچھ تو ہے' کیا کہیں درد ہے؟" اس نے حیا کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر ہمدردی سے تھپتھپایا۔

"درد کا اور میرا رشتہ تو سالوں سے جڑا ہوا ہے۔" وہ مسکرادی۔

"اتنی اذیت پسند مت بنو۔" مہرین نے اس کے دوسرے ہاتھ کو دیکھا۔ جو سینے کی دائیں سائیڈ پر رکھا ہوا تھا۔

مہرین نے اس کے اس ہاتھ کو ہٹایا۔ "یہیں پر درد ہے۔"

"ہاں۔۔۔ کبھی کوئی ٹیس سی اچانک اٹھتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے' مگر ناقابل برداشت۔ مگر فوراً ہی خود ختم ہوجاتی ہے۔"

"ڈاکٹر کو دکھایا؟" مہرین نے اضطراب سے پوچھا۔

"سوچ رہی ہوں' ٹائم نہیں مل رہا تھا۔"

"حیرت ہے' اتنی لاپروائی کہ ابھی تک سوچ رہی ہو' چلو اٹھو میرے ساتھ' میری دوست ہے' بہت اچھی ڈاکٹر ہے۔"

"ارے یار! بعد میں چلیں گے۔"

"دیکھو' کوئی اپائنٹمنٹ لینے کی ضرورت نہیں

ہے۔ وہ اسپتال میں نہیں ہوگی تو فون پر فوراً" پہنچ جائے گی۔" اس نے پکڑ کر اٹھایا۔

"اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔ یہ تمہاری عجلت پسندی۔ افوہ!" وہ مسکرا کر نفی میں سر کو جنبش دینے لگی۔

"آغا خان چلو۔" اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"کوئی پرانی چوٹ یاد پڑتی ہے آپ کو؟"

ڈاکٹر بینش نے تفصیلی چیک اپ کے بعد کہا۔ اس کے چہرے پر ایک تاریک سایہ لہرا گیا۔ نفی میں سر کو جنبش دینے پر اکتفا کیا۔ مگر مہرین کی نظروں سے وہ سایہ چھپا نہ رہ سکا۔

"یہ کچھ ٹیسٹ ہیں، آپ کروالیں، رپورٹس آنے تک ہم حتمی فیصلہ نہیں کرسکتے، باقی آپ خود سمجھ دار ہیں۔"

اسے سخت الجھن ہو رہی تھی ڈاکٹر بینش کے سوالوں سے۔ ٹیسٹ کروا کے وہ جلد از جلد اسپتال کے ماحول سے نکلنا چاہتی تھی۔

دوسرے دن پھر کچھ ٹیسٹ تھے۔ صبح سویرے ہی مہرین نے اسے پک کیا۔

وہ کل کے مقابلے میں کافی فریش تھی۔ سارے مشکل ٹیسٹوں سے فارغ ہو کر وہ لنچ کرنے ہوٹل میں آئیں۔

لنچ کرنے کے بعد کولڈ ڈرنک کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے مہرین نے اچانک سوال داغا۔

"یہ چوٹ تمہیں مختصر کی لگائی ہوئی ہے نا؟"

اس نے اضطراب سے مہرین کو دیکھا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"میں تمہیں اچھی طرح سے جانتی ہوں ڈیر۔ تم کھلی کتاب ہو محبت کرنے والے دوغلے نہیں ہوتے، وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جیسے اندر ویسے باہر۔" مہرین کے باریک تجزیے پر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ جسم کی تو اک چوٹ ہے۔ میری روح تو ایسی سینکڑوں چوٹوں سے بھری پڑی ہے۔" اس کا لہجہ بھر آیا۔

"دل کرتا ہے، قتل کردوں اس کو، جس نے تمہیں اتنا رلایا ہے۔" مہرین نے غصے سے کہا۔

"چھوڑو مہرین! کیوں جان جلاتی ہو جس کی قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے، وہ بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ ہر کوئی اپنے حصے کا رونا خود ہی روتا ہے۔"

٭ ٭ ٭

اک دنیا بھول بھلیاں سی
اک گونگا بہرا اندھا دل

آج دل کو پھر قرار نہ تھا۔ سارے جسم و جان میں بے چینی کروٹیں لے کر بیدار ہو گئی تھی۔ وہ کہیں سے آجائے، اک بار اسے دیکھ لوں، وہ نہ سہی اس کی آواز ہی سہی۔

اس نے فون اٹھایا۔ اس کا نمبر ملا کر کاٹ دیا۔ کیا فائدہ، وہ کبھی بھی نہیں اٹھائے گا۔ میں مسلسل کال کرتی ہوں۔ وہ جھنجلا کر فون ہی بند کر دیتا ہے۔

وہ اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آنسو پونچھ کر پھر فون ملایا۔

"یا اللہ۔۔۔ اس کے دل میں ڈال دے میرا فون اٹھالے۔" اس کے صرف لفظوں سے ہی نہیں پورے وجود سے اخلاص ٹپک رہا تھا۔

ناقابل یقین جب فون سے اس کی ہیلو کی آواز ابھری۔

"مختصر! تم کیسے ہو مختصر؟" بے تابی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"ٹھیک ہوں، تمہارے بغیر بہت خوش، اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ بہت مطمئن بہت آسودہ۔"

وہ اک اک لفظ اسے جتلا رہا تھا۔ باور کرا رہا تھا۔

اس نے کال کاٹ دی۔

وہ اور شدت سے رونے لگی۔ کیا ملا اس کی آواز سن کر، بات کرکے۔

میں نے ایک انسان کی پرستش کی، اس کی سزا یہ ملی ہے کہ وہ کبھی بھی میرا ہو ہی نہیں سکا۔ پرستش تو صرف اس ذات یکتا کی، کی جانی چاہیے جو صرف دینا جانتا ہے، لینے سے بے نیاز، بے پروا ہے اور میری

وقوفی، نادانی تو دیکھو کہ میں بھاگتی رہی اس کے پیچھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

انسان بہت بھٹکتا ہے۔ مٹی کی مورتیوں کے پیچھے، وہ مٹی ہی نکلتی ہیں۔ مٹی جو جھڑ جاتی ہے۔ پک جائے تو ٹوٹ جاتی ہے۔ جو بار بار فنا ہوتی ہے۔ اس کی خاطر اس نے اپنی انا کو فنا کیا۔ خواہشات کو فنا کیا۔ اس کی خوشی کی خاطر غموں کو گلے لگایا۔ بس جس بات میں وہ خوش، جس طرح وہ خوش۔

وہ اگر اس کو چھوڑ کر خوش ہے تو وہ وصال سے دست بردار ہوئی۔ اس کی فون کالز اس کے لیے باعث جھنجلاہٹ ہیں تو اس نے فون کرنا چھوڑ دیا۔ میسجز وہ بغیر پڑھے ڈیلیٹ کر دیتا ہے۔ اس نے میسجز کرنا بند کردیے۔ اپنی ہر خوشی کا قتل کیا۔ محض اس کی خوشی کی خاطر۔ پھر بھی وہ راضی نہیں مطمئن نہیں۔

"بندہ کبھی کچھ صلہ نہیں دیتا۔ بندہ تو صرف اپنی ذات کو، اپنی انا کو خوش رکھتا ہے۔ پھر یہ بے وقوفی ہی ہے کہ وہ اپنے جیسے ادنیٰ کو اعلا تر بنا دیتا ہے اور محبوب حقیقی کو چھوڑ دیتا ہے۔ دور ہو جاتا ہے۔ انسان جاہل ہے کہ ادنیٰ کو اعلا، کم تر کو برتر اور اپنی ریاضت محبت کو بہتر و معتبر مانتا ہے۔ اس غلط فہمی، خوش گمانی میں اللہ اسے پھر کسی بندے کے ہاتھوں ذلیل کرواتا ہے۔ وہ بھگتتا ہے، اپنے کیے کی سزا کاٹتا ہے۔ میں بھگت رہی ہوں، میرے مالک، کاٹ رہی ہوں سزا، میرے دل کو بدل دے، بدل دے۔"

ندامت کے آنسوؤں سے پورا چہرہ بھیگ گیا تھا۔ وہ جھکتی چلی گئی۔ نیچے کارپٹ پر سجدے میں پڑے پڑے اسے کتنی ہی دیر ہو گئی تھی۔

آہستہ آہستہ اس کے دل پر خاموشی طاری ہو گئی۔ نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ بے غم ہو کر سو گئی۔ اپنے سارے غم رب صمد کو سنا کر، بتا کر بوجھ ہلکا ہو گیا۔

٭ ٭ ٭

پاکستان ٹیکسٹائل انڈسٹری کی نمائش لگی ہوئی تھی۔ اس نے تین اسٹالز لگائے تھے۔ ان اسٹالز کو چیک کرکے وہ باہر نکلنے کو مڑا۔ جب حسین رضا سے اس کا سامنا ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے نکلنا چاہتا تھا۔ مگر حسین رضا کا ہاتھ اس کے شانے پر جم گیا۔

"کیسے ہو بیٹا؟"

اس نے حسین رضا کے سوال کا جواب استہزائیہ مسکراہٹ سے دیا۔

"پتا نہیں تمہاری بدگمانی کب ختم ہوگی بیٹا؟"

"کبھی بھی نہیں، کیونکہ میں اپنے باپ کے قاتل کو کبھی معاف نہیں کرسکتا۔"

"یقین کرو میں نے اسے مارنے کی نیت سے انجکشن نہیں دیے تھے۔ وہ معمولی نشے کے انجکشن تھے۔ تاکہ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو بھول سکے۔ اسے ان انجکشن نے نہیں مارا بیٹا! غیرت مند آدمی تھا۔ غیرت کے صدمے نے مار دیا۔"

اس نے اپنے شانے پر رکھے حسین رضا کے ہاتھ کو جھٹکا۔

"اور کتنا جھوٹ بولیں گے۔ اب تو باز آجائیں۔"

وہ تیزی سے باہر آیا۔ گئے دنوں کی باتیں جو وقت کی دھول سے اٹ گئیں۔ وہ پھر صاف ستھری ہو کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔

پتا نہیں کیوں اک گمان سا دل میں آٹھہرا، کیا حسین رضا سچ کہہ رہے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر بے اختیار سوچ رہا تھا۔ وہ سمندر پر آگیا۔

٭ ٭ ٭

وہ اپنی رپورٹس خود لینے گئی تھی۔

"آپ کے لیے اچھی خبر نہیں ہے مسز حیا!"

"مجھے اندازا ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"آپ اتنی ذہین، پڑھی لکھی ہیں، پھر بھی اپنا خیال نہ رکھ سکیں۔ اپنے آپ سے اتنی بے خبر رہیں۔" انہوں نے فائل اس کی طرف بڑھائی۔

"جو سنانا چاہتی ہیں، بے دھڑک سنا دیں۔" وہ مسکرائی۔

اس نے رپورٹ پڑھ کر فائل بند کردی' اسے کوئی دھچکا نہیں لگا تھا۔ جیسے وہ پہلے ہی جانتی تھی۔

"لمبا علاج ہے۔ آپ ذہنی طور پر تیار رہیں۔ پہلے آپریشن کروانا ہوگا۔"

ڈاکٹر نے اسے کچھ اور ٹیسٹ لکھ کردیے تھے۔

وہ وہاں سے اٹھ کر ساحل سمندر پر چلی آئی۔

اسے یاد تھا۔ وہ ظالم لمحہ جب منتظر نے اسے دھکا دیا تھا۔ ٹیبل کا کونا اس کے سینے میں لگا۔ مگر سینے کے اندر دل کا درد اتنا شدید تھا کہ اس نے خیال ہی نہ کیا۔

زخم کینسر میں بدل گیا تھا اور ہڈیوں تک جا پہنچا تھا۔

وہ سمندر کے کنارے چلتی رہی۔

"تو حیا حسین! اس محبت نے تمہیں یہاں تک پہنچا دیا۔ کچھ لوگوں کو محبت جلا بخشتی ہے اور کچھ کو جلا بیٹھتی ہے۔ تمہیں اس نے خاک کردیا۔"

سمندر کی تنہائی سے گھبرا کر مڑی' اس کے عین سامنے منتظر کھڑا تھا۔ وہ پتھر کی ہوگئی۔ یہی حالت اس کی بھی تھی۔ دونوں کو دھچکا لگا تھا۔ اتفاقیہ ملاقات' کیا یوں بھی وہ ایک دوسرے کو سرراہ مل جائیں گے۔

ان دونوں نے تو ان راہوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ جن پر ایک دوسرے کے ہونے کا گمان بھی ہوتا تھا۔

حیرت' سکون' خاموشی' درد' کچھ لمحے ساکت و مبہوت ہوگئے تھے۔

"کیسی ہو۔"

"منتظر حسنین! میں تمہارے بغیر کیسی ہوں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

اس نے دونوں ہاتھ اس کے دونوں شانوں پر رکھے' سسکی ابھری۔

وہ دونوں اپنی بے ساختگی پر حیران تھے۔

وہ خاموش تھا۔ حیا نے آنکھ اٹھا کر اسے دیکھا' مڑی اور تیزی سے چلتی گئی۔

بعض دفعہ انسان اپنے محسوسات سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اسے بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کیا کرے' اس کے پیچھے جائے' روکے یا ہمیشہ کی طرح اپنی راہ لے۔

✡ ✡ ✡

یہ خبر بجلی بن کر اس کے والدین پر گری تھی۔ سارا سرمایہ ایک دم ڈوب جائے تو کیا حالت ہوگی۔ وہ پاگل سے ہوگئے تھے۔ رو' رو کے حمیرا کی آنکھیں دکھنے لگیں۔

حسین رضا نے دنیا کے مشہور ہاسپٹلز سے رابطہ کیا تھا۔ اس کی رپورٹس امریکہ اور برطانیہ کے بڑے ہاسپٹلز کو بھیجی گئی تھیں۔ شاید کہیں سے کوئی مثبت جواب مل جائے۔

امید' دعا' آسرا' علاج' بس اسی سہارے کی بنیاد پر وہ لندن جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ اتنے کام' زندگی اتنی کم' اسے فرصت نہیں مل رہی تھی' کیا کچھ نہ کرنا تھا ابھی اور موت کی دستک سنائی دینے لگی تھی۔ نہیں کوئی مفر کوئی فرار کچھ بھی نہیں۔

موت اور محبت میں کتنی مماثلت ہے۔ آہ... دل خالی... دامن خالی' ہاتھ خالی۔

نہ دنیا میں کچھ کرپائی' نہ ہی آخرت کے لیے۔ تیری مخلوق کی خدمت میں دل لگایا۔ وہ بھی پورا نہ ہوپایا۔

ایک بندے کے عشق میں عمر گنوا دی' کیا ملا؟ صرف انتظار۔

بندے کا ارادہ تو کچھ نہیں' بندے کا اختیار بھی کچھ نہیں۔ پھر انسان زندگی کو اپنے اختیار' اپنی مرضی سے ہی کیوں گزارنا چاہتا ہے؟

یہ سوال بار بار اس کے سامنے سر اٹھاتا اور ہر بار اس کا سر اس رب صمد کے حضور جھک جاتا۔ جس کے پاس سارے اختیار' جس کا ارادہ صرف محتاج کُن' جس کا حکم ہر حکم سے ماورا' جو زندہ... زندہ صرف زندہ... موت سے پاک' اونگھ سے۔ نیند سے ماورا ...ماورالماوری' زندگی میں اس نے کبھی اس محبوب حقیقی کا حق ادا نہیں کیا۔ جو بے نیاز ہے' بھٹکا ہوا اس کے پاس آئے تو... وہ دھتکارتا نہیں۔ تھام لیتا ہے' سنبھال لیتا ہے۔ یہی تو فرق ہے۔ حقیقی اور مجازی محبوب میں۔

میں یہ ذلت بھگت چکی۔ بس اب مجھے پناہ دے۔

✡ ✡ ✡

"بیٹا! یہ انوی ٹیشن کارڈ پڑا ہے۔ چند دن سے... تمہارے کام کا تو نہیں؟" خورشید نے جو اپنی نگرانی میں ماسی سے صفائی کروا رہی تھیں۔ لاؤنج میں بیٹھی صالحہ خاتون سے باتیں کرتی ماہم سے پوچھا۔

ماہم نے ہاتھ میں لے کر دیکھا۔

"اماں! یہ تقریب تو پرسوں ہوچکی ہے۔ اب یہ بے کار ہے۔"

اسے پتا تھا کہ اماں سارے اخبارات' کارڈز پھینکنے نہیں دیتی ہیں۔ ان میں قرآن کا ترجمہ لکھا ہوتا ہے۔ پھینکنے سے بے ادبی ہوتی ہے۔ وہ لفظ کی حرمت برقرار رکھنے کی سخت قائل تھیں۔

"تم اس تقریب کا بتا رہی تھیں نا بیٹا! جہاں حیا آئی ہوئی تھی۔"

"جی خالہ! وہ مہمان خصوصی تھی۔"

"تمہارا اس سے سامنا ہوا؟"

"نہیں خالہ! میں تو اسے دیکھ کر آخری رو میں جاکر بیٹھ گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری دوست کی تقریب میں کوئی بدمزگی ہوجائے۔"

"مگر وہ آئی کیوں تھی بیٹا؟" خورشید نے سادگی سے پوچھا۔

"اماں... وہ این جی او کے مختلف پروجیکٹ کو اسپانسر کرتی ہے۔ اس لیے آئی تھی۔ ان لڑکیوں کو سرٹیفکیٹ دینے' جن کے تعلیمی سلسلے کو' اس نے سپورٹ کیا تھا۔"

"سنا ہے' وہ دل کھول کر لوگوں کی مدد کرتی ہے۔" خورشید دبے لہجے میں بولیں۔

"جی اماں! بہت سی این جی اوز کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ اس نے خود بھی اپنی فاؤنڈیشن بنا رکھی ہے۔"

"ارے بیٹا! حسین رضا نے اتنی حرام کی دولت کمائی ہے۔ آخر کیا کرے گا' اچھا ہے' کچھ غریبوں کا بھلا ہو رہا ہے۔" بخشل ہنسا۔

"بس بیٹا! نبیوں کے گھر کافر' کافروں کے گھر نبی پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ہے تو یہ بھی گناہ گار ماں' باپ کی اولاد' مگر ہے نیک۔"

اندر آتا منتظر ان کی باتوں پر کچھ لمحے کے لیے باہر ہی رک گیا۔

"ہاں اماں! میری دوست بتا رہی تھی کہ تقریب اتنی جلدی اس لیے ارینج کی کہ اسی رات حیا کی فلائٹ تھی۔ لندن جارہی ہے والدین کے ساتھ۔"

"ہاں۔ یہ بھی بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔"

"ہم بھی اب بڑے لوگ ہیں' اب ہم بھی جاسکتے ہیں۔" بخشل اکڑ کے بولا۔

"ہاں بابا! کیوں نہیں۔ اب کے چھٹیوں میں ہم سب چلیں گے۔"

"لو منتظر بیٹا بھی آگیا۔" بخشل نے خوش ہو کر کہا۔ اس نے محسوس کیا' جیسے ماہم نے اس کو دیکھ کر دانستہ موضوع تبدیل کردیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"وہ کہیں بھی جائے' اب اس کا علاج ممکن نہیں۔" ثمرین کو بار بار ڈاکٹر بینش کی بات یاد آرہی تھی۔

اسے رہ رہ کے پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ کیوں میاں کے ساتھ دبئی شاپنگ فیسٹیول چلی گئی۔ جب واپس آئی تو حیا' حمیرا پھپھو' انکل لندن چلے گئے تھے۔

اس نے فون کرکے حیا سے رپورٹس کے بارے میں پوچھا تھا' تو اس نے سب کلیئر ہے' کا بتایا تھا۔ وہ مطمئن ہوگئی۔

ایک ماہ بعد اس کا میسج آیا تھا کہ وہ یورپ کے تفریحی دورے پر جارہی ہے۔ وہ سال میں اک بار بیرون ملک فیملی کے ساتھ جاتی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ جس پر وہ چونک اٹھتی۔

اور آج جب بینش سے ملاقات ہوئی تھی تو بینش

نے حیا کے بارے میں پوچھا تھا۔
"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ آج کل محترمہ یورپ گئی ہوئی ہیں۔"
"وہ کہیں بھی جائے' اب اس کا علاج ممکن نہیں۔ وہ اب لاسٹ اسٹیج پر ہے مہرین!" ڈاکٹر بینش نے افسردگی سے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے پیروں تلے زمین سرک گئی تھی۔
بینش کو اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازا ہوا کہ وہ شاکڈ رہ گئی ہے۔
"لگتا ہے تم لاعلم ہو۔ اس کی بیماری سے۔"
"یہ بات اس نے مجھ سے کیوں چھپائی۔" اس کا گلا رندھ گیا۔
"تمہارے ٹرپ کو بدمزا کرنا نہیں چاہتی ہوگی۔ ایک اچھے دوست کی یہی نشانی ہوتی ہے مہرین۔" گھر آکر بھی وہ پریشان رہی۔
چاہنے کے باوجود وہ فون نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ کیا کہے گی حیا سے' بار بار آنکھیں بھر آتیں' خود میں بات کرنے کا یارا نہ رہا تو اسے میسج کیا۔
"اب کیسی ہو حیا؟"
چند گھنٹوں بعد جواب آیا تھا۔
"پہلے" سے بہتر ہوں۔
اس نے سکون کی سانس بھری۔ وہ اس کے "اب" سے بات سمجھ گئی اور وہ اس کے "پہلے" سے۔
کچھ لوگ کہی ہوئی بھی نہیں سمجھتے اور کچھ ان کہی بھی سمجھ جاتے ہیں۔ جو ان کہی سمجھ لیں ان کا شمار بہترین دوستوں میں ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

حیا نے اپنی غیر موجودگی میں حیا فاؤنڈیشن کی عارضی ذمہ داریاں مہرین کو سونپ دی تھیں۔ اس عرصے میں حسین رضا دوبار پاکستان آئے تھے۔ بزنس ڈیلنگ کے سلسلے میں' مگر یہ حقیقت تھی کہ اب ان کا بزنس میں بھی دل نہیں لگتا تھا۔ دونوں ہمہ وقت حیا کے ساتھ ہوتے۔ ان تینوں فریقوں کو اس بات کا اچھی طرح اندازا تھا کہ جو وقت گزر رہا ہے' وہ پھر نہیں آئے گا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کی کوئی گھڑی ضائع نہیں کرتے تھے۔
وہ خود ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اس کی ماں گھنٹوں اس کو تکتی رہتیں۔ پھر اچانک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ باپ کا دکھ وہ سمجھ سکتی تھی۔ جو اندر ہی اندر گھل رہے تھے۔
اسے لگتا کہ صرف وہی نہیں اس کے ساتھ وہ دونوں بھی اس بیماری کو جھیل رہے ہیں۔ اس کے پاس اب بہت تھوڑا سا وقت رہ گیا تھا اور اسے پاکستان میں بہت سے اہم اور قانونی فیصلے کرنے تھے۔
"میں پاکستان واپس جانا چاہتی ہوں۔"
"جیسے آپ کی مرضی بیٹا!" حسین رضا نے اختلاف نہیں کیا۔
"مگر بابا! پہلے عمرہ کریں گے۔" اس نے حتمی فیصلہ سنایا۔ ان تینوں نے جوش و خروش سے عمرہ کی تیاری کرلی۔
"بابا! اگر حج تک مجھے مہلت ملی تو ہم حج بھی کریں گے' ورنہ آپ دونوں تو حج ضرور کرنا۔"
وہ لرز اٹھے' کانپ گئے۔
"کیسی باتیں کرتی ہے میری جان!" حمیرا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔
"میں نے راتیں جاگ جاگ کر اللہ سے تیری زندگی مانگی ہے' تجھے کچھ نہیں ہوگا۔ تجھے کچھ نہیں ہوگا۔"
وہ ماں کو گلے لگا کر تھپتھپاتی رہی۔ اپنے وجود سے دلاسا دیتی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ سفید احرام میں بہت مشکل سے خانہ کعبہ کے غلاف تک پہنچی تھی۔ وہ اپنی ایڑیاں اوپر اٹھا کر غلاف تک پہنچنا چاہ رہی تھی۔ پاؤں کی انگلیوں اور انگوٹھوں پر جسم کا بوجھ ڈال کر ہر حالت میں غلاف کعبہ کو پکڑنا چاہ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ غلاف سے مس ہو رہا تھا۔ اس

کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔
"تو وہ خدا ہے' جس کو اسی سال تک بت کی پوجا کرتے بت پرست نے بھول کر یا صنم سے یا صمد کہا تھا اور تو نے فوراً" جواب دیا تھا۔
"لبیک یا عبد' میں حاضر ہوں میرے بندے!" اور ملائکہ نے کہا۔ "مولا' اس نے اسی سال تک یا صنم کہا ہے۔ بوڑھا ہو گیا ہے' اونگھ آگئی ہے۔ تب ہی غلطی سے یا صمد پکار بیٹھا ہے' تجھے نہیں پکارا۔ غلطی سے کہہ بیٹھا ہے۔ تو پھر بھی جواب دے رہا ہے اور تو نے فرشتوں کو کہا تھا۔ "پھر مجھ میں اور اس بت میں کیا فرق رہ جائے گا۔ جس نے اسی سال تک اسے جواب نہیں دیا۔"
میں اکیسویں صدی کی وہی بت پرست ہوں مالک یا صنم کہنے والی' سالوں تک صنم صنم کرتے' عمر کی ساری پونجی لٹا کر اب صنم سے صمد یاد آیا ہے اور صمد اتنا مہربان' اتنا رحیم' اتنا کریم' شکوہ نہیں کرتا' طعنہ نہیں دیتا' دھتکارتا نہیں۔
اپنے دوار سے لوٹاتا نہیں۔ فوراً" سایہ عافیت میں لے لیتا ہے۔
بے شک یہی تیری شان۔
یہی تیرا ظرف ہے۔
کوئی پلٹے تو تیری جانب
اور میں حیا حسین' پلٹ آئی ہوں تیری جانب۔
مجھے اپنا لے۔
مجھے سکون دے۔
مجھے راحت دے اپنے ذکر میں۔
مجھے معروف کر اپنی فکر میں۔"
وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ با آواز بلند دعا مانگ رہی تھی۔ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔
اس کے دل پر سکون کا نزول ہو رہا تھا۔ اس نے خود کو رب کعبہ کو سونپ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر لیٹ آیا تھا۔ چینج کر کے سونے کی تیاری کرنے لگا۔ بیٹی کے کمرے میں آیا۔ اس کو پیار کر کے چادر ٹھیک سے اوڑھائی' اپنے کمرے میں آیا تو ماہم سو چکی تھی۔
کتنی پرسکون نیند تھی۔ زندگی کتنی مطمئن اور پرسکون ہے۔ اس کی سنگت میں۔ اسے ماہم پر پیار آرہا تھا۔
وہ چادر صحیح کر کے سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ جب میسج ٹون بجی' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی جماہی لیتے ہوئے موبائل اٹھایا۔
حیا کا نام اسکرین پر دیکھ کر' ناگواری تو ضرور ہوئی' مگر کافی عرصے بعد اس کا میسج آیا تھا۔ پڑھے بغیر رہ نہیں پایا۔

سارے جھگڑے تھے' زندگانی کے انیس
جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

"زندگی جو میری آنکھوں میں جیتی تھی' آنکھوں میں ہی مرگئی۔ اب آخری بار ملنے کے لیے آجاؤ' کہیں حسرت دیدار نہ رہ جائے۔"
"مکر و فریب تو تم لوگوں کی ذات سے منسلک ہے۔ پھر کوئی نیا ڈرامہ کیا ہے؟"
اس نے جواب دے کر فون رکھا تھا کہ اس کا میسج پھر آیا۔ وہ پڑھنے سے رہ نہیں پایا۔
"محبت ہم جیسوں کے لیے روح کی تکمیل ہوتی ہے۔ تمہیں کیا پتا مختصر حسنین! تم کیا جانو' ہم کوزہ گروں نے جہان معلوم کے خزانے سے کیسے کیسے موتی چنے اور محبت کے خزینے پائے۔ اب محبت مجھے تہجد پڑھنے والے کی طرح اطمینان قلب مہیا کرتی ہے۔"
اس کے پاس اس کے میسج کا کوئی جواب نہ تھا۔ دل ہی دل میں خود کو کوسا' جو اس کے میسج کا جواب دے دیا۔ شاید یہی وہ چاہتی ہے۔ نیند آئی تو' مگر بڑی مشکل سے۔
اس کے دوسرے میسج کا کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ وہ ایک گھنٹے تک بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔

سر شدید درد سے پھٹا جارہا تھا۔ تھکن ہاتھوں' ٹانگوں پورے وجود میں اتر آئی۔ وہ بیڈ سے اٹھی۔ چپل کلرلی اور وہیں کمرے میں ٹہلنے لگی۔

دس سال اتنی لمبی اتنی کڑی ریاضت۔۔۔ کیا پایا' وہ آج بھی وہیں کھڑی تھی۔ اسے لگا' یہ دس سال کا سفر پاتال کا سفر تھا۔ عروج کا نہیں زوال کا سفر' جہاں وہ غروب ہوگئی۔

جتنا اس کی چاہت کی دلدل سے نکلنا چاہا' اتنا دھنستی چلی گئی۔

تھکاوٹ اس کی رگوں سے گزر کر دل کے اندر پہنچ گئی۔ اس نے کئی بار سوچا' عشق طلب سے ماورا ہے۔ محبت میں لین دین کا کوئی سلسلہ سرے سے موجود ہی نہیں۔ محبت تو دین ہی دین ہے۔ مگر اب تھک گئی تھی۔ دس سال اس نے صرف دیا تھا۔ لیا کچھ نہیں' اس کی جھولی محرومیوں' نفرت اور دھتکار سے بھری ہوئی تھی۔

وہ اس اذیت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ آنسو اس کے رخساروں پر سے پھسلتے چلے گئے۔ رفتار کم یا زیادہ ضرور تھی۔ وہ لڑکھڑائی' بے چینی سے اٹھی۔ اسے کسی کل چین و قرار نہیں تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں چکراتی رہی۔

منتظر چاند پر بیٹھا تھا اور وصال کا لمحہ ناقابل تسخیر تھا۔ وہ چکور کی طرح چکراتی رہی۔ اسے لگ رہا تھا۔ وہ اس کے گرد چکرا چکرا کر مرجائے گی۔

وہ رات کے میسج بھول چکا تھا۔ ناشتہ کرکے آفس پہنچا۔ ایک اہم کاروباری وفد سے ملاقات تھی۔ اس معاہدے کو حتمی شکل دے کر میٹنگ روم سے آفس میں آیا تو بیرسٹر وقار احمد کو موجود پایا' مصافحہ کرکے انہوں نے اس کے سامنے ۔۔۔ ایک فائل رکھی۔

"حیا بی بی بیمار ہو کر ہاسپٹلائز ہوگئی ہیں۔ یہ وصیت نامہ ہے ان کا۔ انہوں نے اپنے حصے کی جائیداد کا کچھ حصہ' آپ کی بیٹی مریم فاطمہ کے نام کردیا ہے اور اکاؤنٹ میں ان کے حصے کی جو رقم بنتی ہے حیا فاؤنڈیشن کو ڈونیٹ کی ہے۔ ایک اور اہم بات' جب تک ان کے والدین حیات رہیں گے تب تک وہ حیا فاؤنڈیشن کے چیئرمین رہیں گے۔ ان کی وفات کے بعد بورڈ آف گورنرز کی سربراہی مریم فاطمہ کریں گی' اگر وہ بالغ ہوگئیں' ورنہ ان کی بلوغت و تعلیم مکمل ہونے تک یہ ذمے داری آپ نبھائیں گے۔

اور سب سے اہم اور خاص بات حسین رضا اور حیا حسین کے نام باقی جو جائیداد ہے۔ وہ حیا فاؤنڈیشن کو ڈونیٹ کردی گئی ہے۔"

بیرسٹر صاحب اور کیا کچھ کہتے رہے۔ اس کی سوئی ان کے اس جملے پر اٹک گئی تھی۔ "حیا بیمار ہو کر ہاسپٹلائز ہوگئی ہے۔"

اس سے آگے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ پتا نہیں کیسے سائن کیے۔ کب وقار صاحب گئے۔ دل میں اک انوکھی سی کسک نے سر اٹھایا تھا۔

"میں اس سے محبت نہیں نفرت کرتا تھا۔ پھر کیوں اس کی بیماری نے پریشان کردیا؟"

وہ حسب معمول گھر گیا۔ ماہم کے ساتھ شام کی چائے پی۔ لان میں مریم کو کھیلتے دیکھتا رہا۔ ماہم سے باتیں کرکے اپنا دھیان بٹانا چاہا۔

"آپ کی طبیعت تو صحیح ہے؟" ماہم نے اس کی بے ربط' بے دھیان سی گفتگو سے اندازا لگایا۔

اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"ریسٹ کرلیں۔ کام کی اتنی ٹینشن لیتے ہیں تاکہ اپنا خیال رکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔" وہ خاموش رہا مگر اندر اندر "حیا ہاسپٹلائز ہوگئی ہے۔" کی گونج جاری تھی۔ ماہم نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے لاؤنج سے اٹھایا اور بیڈ روم میں لے آئی۔

"پلیز۔ کچھ دیر آرام کرلیں۔" اور وہ اس کے کہنے پر بچوں کی طرح آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ ماہم آہستہ سے دروازہ بند کرکے کمرے سے نکل گئی۔ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

اس کے دل کے اندر دھڑکنوں سے بھی ایک ہی آواز آرہی تھی' حیا بیمار ہوگئی ہے۔

ہر طرف یہی شور تھا۔

حیا بیمار ہوگئی ہے۔ اس کا سر درد سے پھٹا جارہا تھا۔ اچانک کیسی بے چینی نے اسے آن گھیرا تھا۔ اس کے دل سے آواز اٹھی اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ اسے حیا کے پاس ہونا چاہیے۔ وہ اپنی اس خواہش پر حیران رہ گیا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا' وہاں نفرت نہیں۔ اس کی جگہ ہمدردی مقیم ہوگئی تھی۔ وہ اس ہمدردی کو محبت کا نام دینے سے ڈر رہا تھا۔ "میں بھلا کیسے اس سے محبت کرسکتا ہوں۔ وہ میرے والدین کے قاتلوں کی اولاد ہے۔" مگر وہ حیران رہ گیا۔ جب دل نے یہ ماننے سے انکار کردیا۔ دل تو اس وقت کچھ بھی نہیں سوچنا چاہ رہا تھا۔ اس وقت اسے صرف حیا حسین یاد تھی۔ جس نے اسے چاہا۔ اس سے ٹوٹ کر محبت کی۔ ایسی ٹوٹ کر کہ وہ خود ٹوٹ گئی۔ اس نے سیل فون اٹھایا۔ حیا کے نمبر پر کال کی۔ فون پر جواب موصول نہیں ہوا۔ اس نے بیرسٹر وقار سے فون پر اسپتال کا نام پوچھا۔

گاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل آیا۔

"آپ کہاں جارہے ہیں؟" ماہم نے پوچھا۔ وہ اسے حیران ہی چھوڑ کر چلا آیا۔ اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا' کسی سے بھی بات کرنے کو۔

☆ ☆ ☆

"کوئی مجھ سے یہ ساری جائیداد' ساری دولت لے جائے' مجھے میری بیٹی کی زندگی دے دے۔ میں سب کچھ دینے کو تیار ہوں۔" حسین رضا کسی سے کہہ رہے تھے۔ اس نے اک نظر اس ٹوٹے ہوئے شخص کو دیکھا۔

انہوں نے اسے روکا نہیں' نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ خاموشی سے روم کی طرف اشارہ کردیا۔ دس سال تک انتقام لیتے لیتے نفرت کا جذبہ کہیں سرد ہوگیا تھا۔ ایک انسان بھلا کتنی نفرت کرسکتا ہے۔ جبکہ یہاں تو بندہ محبت سے بھی تھک جاتا ہے۔ وہ بھی نفرت کرتے تھک گیا تھا اور وہ کیسی لڑکی تھی۔ جو نفرت پاکر بھی نہ تھکی' وہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ جب مہرین باہر نکلی۔ وہ عین دروازے کے بیچ کھڑی تھی اور غصے سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ بیماری دینے والے بھی آپ ہی ہیں۔ یاد ہے اپنا وہ ستم' دھکا دے کر ٹیبل کے کونے پر گرایا تھا۔ تب تو صرف درد دل ہوا' مگر پھر یہ ناسور بن گیا۔ اس کی جان کا۔"

اس کے پاؤں تلے سے زمین سرک رہی تھی۔ وہ کھڑا نہیں ہو پا رہا تھا۔ اف وہ اک چھوٹی سی غلطی' اتنا بڑا ناسور' میں بھی قاتلوں کی صف میں آکھڑا ہوا۔ ہوا میں معلق ہو رہا ہوں۔

"سب سے بڑے ناسور تم ہو' ظالم انسان!" مہرین کا غصہ اسے غصہ نہیں دلا رہا تھا۔ وہ اسے حق بجانب تصور کر رہا تھا۔ اس کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو ایک لفظ بھی نہ تھا۔

حسین رضا نے بڑھ کر مہرین کو بازو سے پکڑ کر آگے سے ہٹایا۔ اور اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔

وہ سامنے بیڈ پر لیٹی تھی۔ بہت کمزور نحیف' وہ جب آخری بار سمندر پر ملا تھا۔ تب تو وہ ٹھیک تھی اچانک ان دو سالوں میں کیا ہوگیا تھا۔

اس نے ہینڈل کی آواز پر اس طرف دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ کسی مجرم کی طرح چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر اس کے قریب آیا۔

"مجھے یقین تھا۔ منتظر حسنین! تم ضرور آؤ گے۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔ خوشی سے یا غم سے' وہ اندازا لگانے سے قاصر تھا۔

"کیسی ہو؟" وہ بمشکل ایک جملہ بول پایا۔ اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ منتظر حسنین کا عکس دھندلا پڑا تھا۔

"دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا۔" اس نے مسکرانے کی کوشش کی' مدھم آواز میں شکستگی جھلکتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنی ہمت مجتمع کرنے میں دقت ہوئی۔

"تم۔۔۔ تم ٹھیک ہوجاؤ گی۔"

سب سربسر فریب ہیں' کیا ان کا اعتبار
پیار' حسن و عشق' جوانی' محبتیں
اگر کوئی حقیقت ہے تو وہ صرف موت ہے۔" اس کے لبوں پر بڑی تلخ مسکراہٹ اتری۔

وہ بیڈ پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس پر جھکا۔

"تم تو سراپا محبت ہو اور محبت حیات کی نوید ہے۔" حیا حسین چند لمحوں تک اپنے اوپر جھکے مختطر حسنین کی آنکھوں میں اپنا مرجھایا ہوا عکس دیکھتی رہی۔

موت کیا ہے؟ اک لفظ بے معنی
جس کو مارا' زندگی نے مارا

لبوں نے جنبش کی اور مختطر حسنین کے پاؤں تلے سے اک بار پھر زمین سرک گئی۔ وہ ڈھارس دینے میں ناکام ہو گیا۔ اس کی سالوں پر محیط نفرتیں دھتکاریں' بھوت بن کر اس کے ارد گرد ناچنے لگیں۔

حیا کی مُوندی ہوئی آنکھوں کے کونے سے اک بے آسرا آنسو نکل کر کنپٹی میں گم ہوا۔ مختطر حسنین کے گرد پچھتاووں کا گھیرا تنگ ہونے لگا۔

☼ ☼ ☼

"انکل! پتا نہیں وہ ظالم کیا کرے گا اس کے ساتھ۔" مہرین تڑپ رہی تھی۔

"کچھ نہیں کرے گا بیٹا۔ میں نے آج اس کے اٹھتے قدموں سے جان لیا ہے۔ آج وہ جیتا ہوا نہیں' جیتی بازی ہارا ہوا لگ رہا ہے۔"

اسی وقت وہ باہر نکلا تھا۔ مہرین فوراً" کمرے کے اندر گئی۔

حیا اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟"

"دیکھا' میں نہ کہتی تھی' وہ ہار جائے گا میری محبت سے۔" سوال کا جواب کچھ اور آیا۔

"اسے ہارنا ہی تھا۔ نفرت محبت کا مقابلہ نہیں کر سکتی' ہار جاتی ہے۔" اس نے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔

"سنو مہرین۔۔۔!" اس کی آواز میں اشتیاق تھا۔ "رات میں نے پہلی بار اسے بھول کر اللہ کو پکارا تھا اور اللہ نے اسے سارے کا سارا میری طرف پھیر دیا۔ اللہ کتنا کریم ہے نا۔"

"ہاں بے شک اللہ بہت بڑا کریم ہے۔" مہرین نے بھیگی آواز میں جواب دیا۔

"مہرین!" اس کی آواز میں اشتیاق تھا۔ حیرانگی' تجسس اور خوشی۔ "میں نے پہلی بار اس محبت کو محسوس کیا ہے جو اللہ کو اپنے بندے سے ہے۔ اللہ کتنا کریم ہے نا۔"

اس کا لہجہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس محبت کی عجیب روشنی چمک رہی تھی۔ "آج میں نے اس کی آنکھوں میں وہ محبت دیکھی جو دس سال سے خود بھگتی رہی ہوں۔"

"تمہیں یقین نہیں آ رہا کیا؟" اس نے مہرین کو لب کاٹتے' ضبط کرتے دیکھ کر پوچھا۔

"مجھے یقین ہے۔" مہرین نے اپنے بے اختیار بہنے والے آنسوؤں کو فوراً" ہاتھ کی پشت سے پونچھا۔

"میں نے سمجھ لیا' نہیں۔" اس نے فوراً" نفی میں سر کو جنبش دی۔ "نہیں۔ میں نے نہیں سمجھا۔ اس نے اپنے فضل سے مجھے سمجھایا' میرے دل پر الہام کیا کہ سب "اسی" کے ہو جاتے ہیں' جو صرف "اس" کا ہو جاتا ہے۔"

حیا نے "اس کا" پر ہاتھ کی شہادت کی انگلی اوپر اٹھائی تھی۔

"اس کی محبت کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔"

جو بقا کی طرف دوڑا' وہ کامیاب' جو فنا کی طرف دوڑا وہ ناکام' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

☼ ☼ ☼

وہاں کاریڈور میں سب تھے۔ سوائے حمیرا کے اس کی ہمت نہیں پڑی پوچھنے کی' شاید ماں ہے' برداشت نہیں کر سکتی۔

"کیوں بیٹھے ہیں آپ یہاں' ہمارے ضبط کا امتحان

لینے؟" مہرین ایک بار پھر آئینہ بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"وہ میری بیوی ہے۔" اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

"اور یہ بات دس سال بعد آپ کو یاد آئی ہے؟" طنزیہ لہجے پر اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

وہ اٹھ کر باہر آیا' مگر اس کا دل نہیں چاہا کہ وہ گھر جائے' پارکنگ ایریا میں اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔

ماہم کے فون پر فون آ رہے تھے۔ اس نے جھنجلا کر سیل آف کر دیا۔ سر کار کی سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔ اسے کسی کل چین نہ تھا' بار بار آنکھیں بھیگ جاتیں' اس کی نیند' بھوک سب اڑ چکی تھی' ندامت سی ندامت تھی۔

"تم نے تو اس بے گناہ سے معافی بھی نہیں مانگی مختطر حسنین!"

ضمیر نے ملامت کی' اس کے اندر جیسے بجلی سی بھر گئی' وہ فوراً" باہر نکلا۔ گاڑی کو لاک بھی نہیں کیا' سیل بھی نہیں اٹھایا' تیز تیز قدم اٹھا کر اندر آیا۔ اس کے بیڈ کے گرد ڈاکٹر کھڑے تھے۔

"پلیز۔ آپ باہر جائیں۔" ڈاکٹر نے اس سے درخواست کی۔

"پلیز ایک منٹ!" اس نے ڈاکٹر سے عجلت میں اجازت چاہی۔ وہ اس پر جھکا' اس وقت اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ سانس بہت تیز تیز چل رہی تھی۔

"حیا! مجھے معاف کر دو' اللہ کے لیے' مجھے معاف کر دو۔" وہ رو پڑا۔

ڈاکٹر نے اسے بیڈ سے دور کیا۔ اس نے دیکھا' وہ سب وہاں موجود تھے مگر گونگے آنسو بہا رہے تھے۔

ڈاکٹرز اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ مختطر کے دل میں اس کے لیے محبت کا سمندر موجزن ہو رہا تھا' اس کی اکھڑتی سانسیں اس کے دل کو اتھل پتھل کر رہی تھیں۔

وہ اپنے اس احساس کو مرنے والی سے ہمدردی کا نام قطعی نہیں دے سکتا تھا۔

"یہ ہمدردی نہیں ہے۔" اس کے دل کی ہر دھڑکن اعتراف کر رہی تھی۔ اس کی بے پناہ چاہت کا۔

وقت کی پرواز بہت تیز تھی۔ اور مختطر کے ہاتھ میں ناپید' ایسا جال' ڈور ناپید جس سے وہ وقت کو باندھتا' روکتا۔

ایسے طلسم و سحر و وظیفے سے بھی یکسر ناواقف تھا وہ اس لمحے خود کو بے تحاشا بے بس محسوس کر رہا تھا۔

انسان کتنا مجبور و لاچار ہے' کسی بھی بات' وقت' حالات حتیٰ کہ اپنے دل احساسات اور آنسوؤں پر بھی اس کا بس نہیں چلتا' اس سمے اس نے جانا' انسان کی بذات خود کوئی وقعت' حیثیت' حاکمیت نہیں' وہ صرف مجبور محض ہے۔

اس سے تو اپنا دل بھی کنٹرول نہیں ہوتا۔ اس نے اس کی سانسوں کے ساتھ اپنے ڈوبتے دل کو اتھاہ تاریکیوں میں محسوس کیا۔

رات اس کے ہاتھ سے پھسلتی تھی' اور وہ رات کے ساتھ' حیا کو بھی پکڑنے میں ناکام ثابت ہوا۔ وہ دور نکل گئی۔

جان ہی دے دی' جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

"تمہارے ہاتھوں کا کھانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ حیا جب اپنے ہاتھ سے کھلاتی ہے' تو میں ہر نوالے کے ساتھ اس کا ہاتھ چومتی ہوں۔ اللہ نے پتا نہیں ہماری کس نیکی کا صلہ دیا ہے' ایسی اچھی بیٹی دے کر۔ اللہ کرے وہ ٹھیک ہو جائے' رات فون پر بات ہوئی تھی۔ کہہ رہی تھی' اماں بہت جلد سری لنکا سے آنکھیں ڈونیٹ ہوں گی' میں نے ڈاکٹر سے بات کر لی ہے۔ آپ کے آپریشن کے لیے' میں نے کہا' جب آنکھوں کا آپریشن ہو گا' تو سب سے پہلے تمہیں دیکھوں گی۔ میری بینائی تو وہ ہے' اللہ اسے صحت و تندرستی سے نوازے۔ بڑی دعائیں ہیں غریبوں کی اسے' تم سن رہی ہو سکینہ!"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ بیگم صاحبہ!" سکینہ نے ہچکی روکتے

ہوئے کہا۔

"ناشتا کرلیں جی! پھر دوائی بھی لینی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ مگر دوائی کھانے کے بعد حیا کا نمبر ملا کر دینا' پتا نہیں کیوں رات سے دل ڈوب رہا ہے' آواز سنوں گی' تو قرار آئے گا' ماں ہوں نا آخر' اس کو کچھ ہوتا ہے' طبیعت بگڑتی ہے' تو میرا دل خود بخود ڈوبنے لگتا ہے۔

سکینہ! یہیں پر ہونا' سن رہی ہو نا میری باتیں۔"

"جی۔ جی بیگم صاحبہ!" سکینہ نے اپنے خاموش آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"آج پتا نہیں کیا بات ہے۔ حلق میں نوالے پھنس رہے ہیں۔ شاید اندرونی بخار ہے' یا کچھ اور صبح حسین سے بات ہوئی تھی۔ کہنے لگے۔ "حیا سوگئی ہے ہم ناشتا کرلو' پھر بات کرواؤں گا' اب دیکھو کیسے شرائط باندھتے ہیں۔ یہ باپ بیٹی۔" وہ حیا کا تصور کرکے ہنسیں۔

"پتا ہے سکینہ یہ ان باپ بیٹی کی عادت ہے' حیا جب چھوٹی ہوئی تھی' مجھے اگر بخار ہو جاتا اور کھانا اچھا نہ لگتا' تو یہ دونوں بھی کھانا نہیں کھاتے' کہتے تم کھاؤ گی' تو ہم بھی کھائیں گے' ورنہ نہیں اور حیا باپ کی ہاں میں ہاں ملاتی رہتی آج بھی مجھے ناشتا اچھا نہیں لگ رہا' مگر حسین سے وعدہ کرچکی ہوں' کیا کروں۔" وہ چند نوالے کھا کر رک گئی۔

"بس اب اور نہیں۔" اس نے ٹرالی کو اپنے آگے سے ہٹایا۔

"بیگم صاحبہ ٹیبلٹ!" اس نے ان کے ہاتھ پر ٹیبلٹ رکھ کر دوسرے میں پانی کا گلاس تھمایا۔

"یہ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے گلا خراب ہے کیا؟"

اس وقت ایمبولینس آکر رکی۔ سکینہ زور زور سے رونے لگی۔

باہر ٹینٹ لگ چکے تھے مہمان آرہے تھے۔

"کیا ہوا سکینہ؟" ان کا دل ہول گیا۔

"حیا بی بی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔" سکینہ نے ہچکیوں کے درمیان بات مکمل کی۔

"نہیں۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے' حیا مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ نہیں نہیں حیا نہیں مر سکتی۔"

سکینہ ان کی وہیل چیئر دھکیل کر ہال میں لے آئی۔

"حیا مر گئی۔"

اٹھتی سسکیوں نے اسے یقین دلا دیا۔

وہ وہیل چیئر پر بیٹھی تھی اس کے ہاتھ حیا کے مردہ چہرے کا لمس محسوس کر رہے تھے۔

"حیا! اٹھو بیٹا! مجھے زندہ درگور تو نہ کرو' حیا کچھ تو بولو میری جان' مجھے تمہارے ہاتھ کے سوا کھانا کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

حیا ان کی کسی پکار و سوال کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ وہ اپنا سر پکڑ کر رونے لگیں۔

"کیا ہوا' یہ کیا ہو گیا؟"

"پھپھو جان! صبر کریں۔ صبر کریں۔" مہرین اس کو لپٹا کر زار و قطار رونے لگی۔ اس نے ٹٹول کر مہرین کے ہاتھ پکڑے۔

"حیا نہیں مر سکتی' حیا نہیں مر سکتی۔" وہ بھول گئی تھیں کے حیا تو اس دن مر گئی تھی۔ جب ان کے دیدوں کا پانی عملاً "سوکھ گیا تھا۔ جب انہوں نے اپنے شوہر کو مار دیا تھا۔ ان کی اندھی آنکھیں حیا کا آخری دیدار کرنے سے قاصر تھیں۔ اس نابینا پر خستہ سمیت سب کو رحم آرہا تھا۔ مگر ان کی مدد کرنے سے لاچار و مجبور سب بے بس ان کی ساری کوتاہیوں' چونٹیاں بن کے ان کے جسم پر رینگنے لگے۔ ان کے کیے ظلم اس کے سامنے ایستادہ تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگے' اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی نازوں پالی بیٹی کو مٹی میں دفن کیا تھا۔

ہم اپنے نفس کی نگہبانی نہ کرسکے۔ اب دریدہ دامن لیے خس و خاشاک پھانکتے ہیں۔

لقمے سے ذائقہ گیا' دولت سے مسرت گئی وحشت ہے۔ جو آٹھوں پہر گھیرے رہتی ہے' کب زندگی کے باقی ماندہ دن کٹیں گے۔ کب آسودہ خاک ہوں گے' یا وہاں بھی نا آسودگی ہماری منتظر ہوگی۔ ہم اندھا دھند جائز و ناجائز' حرام و حلال کی تفریق کیے بغیر اپنی خواہشوں کے پیچھے بھاگتے رہے۔

ہماری اندھی خواہشوں کے اندھے راستوں نے ہمارے گھر کی اکلوتی شمع کو بجھا دیا۔

کاش۔ کاش اس دن میں اپنے بھائی سے جائیداد کا حصہ لینے نہ جاتا' اتنی دولت نے کون سی خوشی دے دی۔ انسان بھلا کتنا کھا سکتا ہے۔ کتنا لٹا سکتا ہے۔ یہ بہت زیادہ تھی۔ میرے لیے میری بیٹی' بیوی ساری عمر عیش کرتی رہتی تب بھی کم نہ پڑتی اور اب تو بیٹی بھی نہیں۔

ہم نے روایات کے پیچھے مذہب کو بھلا دیا' اسی لیے اسلام نے دیور بھابھی کا بھی پردہ کروا دیا۔ نامحرم کے ساتھ تنہائی کو منع کیا۔

یہ کتنا آسان تھا اگر ہمارا معاشرہ رسم و رواج اور روایتوں کی زنجیر میں نہ جکڑا ہوتا۔

اگر شادی سے قبل حمیرا سے رضامندی پوچھ لی جاتی۔

اگر معاشرہ اسے طلاق لے کر پسند کی شادی کرنے کی اجازت دیتا۔

نہ وہ ڈرامہ کرتی نہ وہ قاتل بنتی۔ اپنی خوشیوں کو حاصل کرنے کے لیے اسے ایسے گھناؤنے کام نہ کرنے پڑتے۔

طلاق کو ناپسندیدہ فعل ہونے کے باوجود جائز قرار دیا گیا' ایسے ہی ناپاک گناہوں کو نابود کرنے کی خاطر۔

چور دروازے بند کرنے کی خاطر اسلام نے ہر جائز دروازہ فطرت انسان کی کمزوری کی بنا پر کھلا رکھا' اس لیے یہ محض رسم و رواج کا مذہب نہیں۔

پورا ضابطۂ حیات اور دین فطرت ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ جو صرف مجھ سے ہی نہیں' مگر میری خوشبو' میری پرچھائیوں سے بھی محبت کرتی تھی' وہ میرے انتقام کی بھینٹ چڑھ گئی۔

جو کفارہ بنی کسی گناہ کا' وہ مجھے گناہ گار کر گئی۔

وہ جس کا وجود آنکھوں کی لالی' سوہنا سراپا' سب محبت تھی۔

میں نے اس کو الٹ دیا۔

لبوں کی لالی کو آنکھوں کی لالی میں بدل دیا۔

دل کو مسلا اس کے سراپے پر نفرت کا داغ لگایا' مگر اس کے باوجود وہ خوب صورت ہی رہی۔ کملا مرجھا کر بھی۔

بس میں ہی کور چشم رہا۔

وہ کس سے تعزیت کرتا' اپنے دل سے جو ماتم زدہ تھا۔

اپنے اس مشفق چچا سے جنہوں نے ماضی کا کوئی شائبہ حال تک نہیں آنے دیا' ہمیشہ محبت و شفقت سے پیش آئے

وہ پورے تین دن بعد گھر آیا تھا' وہاں اس کی غیر موجودگی نے کہرام مچایا ہوا تھا۔

"غضب خدا کا' وہ اس کے سوگ میں حسین رضا کے ہاں بیٹھا ہوا ہے۔" حمید کا غصہ تو کسی طور کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔

وہ آیا تو دوپہر کا کھانا میز پر لگ چکا تھا۔

"آیئے' کھانا کھالیں۔" گو کہ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اور حلیہ دیکھ کر ہاشم کو دھچکا ضرور لگا تھا' مگر اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

"تم اس کا غم منا رہے ہو بیٹا! جو تمہارے والدین کے قاتلوں کی بیٹی تھی' اچھا ہوا جو حسین رضا اور حمیرا کو اپنی زندگی میں کیے کی سزا مل گئی' خس کم جہاں پاک۔"

آخری بات نے اس کو بے حد طیش دلا دیا' وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بس کریں ماموں! بہت ہو چکا۔ حمیرا کو سزا مل گئی حسین رضا نے بھی سزا بھگت لی۔ لیکن منتظر حسنین نے جو کیا' ایک بے گناہ کو سزا دی۔ اس کا حساب بھی کہیں درج ہو رہا ہے۔ میں آپ لوگوں کے بار بار یاد

ولانے پر' بھڑکانے پر اس سے انتقام لیتا رہا جس کا کوئی قصور ہی نہیں تھا۔ جو صرف محبت کرنا جانتی تھی۔ ان لوگوں نے جو بھی جوانی کے بے لگام گھوڑے پر سوار ہو کر جو کیا' اس کی تلافی کرنا چاہی' مجھ سے معافی مانگ لی۔ مگر جو میں نے ایک بے گناہ کے ساتھ کیا۔ اس کی کیا تلافی ہے؟ میں کس سے معافی مانگوں' یہ سمجھا دیں۔

اصولاً" تو میں آپ لوگوں کا خیال رکھ سکتا تھا۔ الگ گھر میں بھی رکھ سکتا تھا۔ آپ کو' محبت و عزت سے' اور بخشل کو بھی بھاری رقم دے سکتا اتھا۔ اس کی اور اس کی بیٹی کی زندگی سنوارنے کے لیے اور خود حیا کے ساتھ مطمئن زندگی گزار سکتا تھا۔ اس محبت سے پُر لڑکی کا کیا قصور تھا۔ جس کو آپ لوگوں کے طیش ولانے پر میں نے ہر طرح سے انتقام کا نشانہ بنایا۔ میں بھی اپنے باپ کی طرح کانوں کا کچا ہی نکلا۔

آپ دونوں تو اپنا ذاتی انتقام بھی میرے ذریعے لے رہے تھے۔ اور مجھے یہ بات سمجھنے میں اتنے سال لگ گئے۔ جب کچھ بھی باقی نہ بچا۔"

وہاں سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ ملک تھا' ملک بن کر دکھا دیا' اس وقت وہ سب اس کے کمی لگ رہے تھے۔

"آپ لوگوں نے ماہم کو آگے بڑھایا۔ اس نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ حمیرا نے حسین رضا کو پانے کے لیے جال بچھایا تھا۔ ماہم نے حیا کی دولت اس کے شوہر کو پانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اپنی اداؤں سے مجھے محبت کا اسیر کیا۔

حمیرا اور حسین رضا کی سزا پر خوشی منانے سے پہلے یہ سوچ لیں کہ ماہم اور میری بھی ایک بیٹی ہے اور ایک بے گناہ کو میں بھی قتل کرنے کا مرتکب ہوا ہوں۔ اور اس میں ماہم کی کوشش بھی شامل رہی ہے۔ ہمارے گناہوں کی سزا کس کو ملے گی؟"

ماہم کے پیروں تلے زمین سرک گئی۔ وہ آسمان سے فرش پر آ گری' وہ جیت کر بھی ہار گئی تھی' اور حیا ہار کر بھی جیت گئی تھی۔

اسے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں حیا کی محبت' کرم نوازیاں' اعلا ظرفی غضنفر کو اس سے چھین نہ لے۔

ایسا ہی ہوا' وہ اس کا تھا' مگر اب لگتا ہے کہ ایسا تو کبھی بھی نہیں تھا۔ اسے اپنی کم حیثیتی کا جو اوراک تھا۔ وہ آج کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ ماہم کو اپنی کم ظرفی کا احساس ہوا تھا اور حیا بہت بلندی پر نظر آتی تھی۔

"کچھ لوگ زندگی میں ہی مر جاتے ہیں' اور کچھ لوگ مر کر زندہ ہو جاتے ہیں۔ حیا مر کر غضنفر کے دل میں زندہ ہو گئی۔ اور میں اس کی زندگی میں ہو کر بھی اب نہیں رہی۔"

ماہم نے چپکے سے آنسو پونچھے۔

غضنفر جا چکا تھا' ان سب کو آئینے میں ان کے چہرے دکھا کر۔

☼ ☼ ☼

وہ ان کے پاس پھر آیا تھا۔ ان کے پاس بیٹھا تھا۔

وہ ان کی بیٹی کا قاتل تھا اور وہ اس کے باپ کے قاتل' دونوں حساب میں برابر تھے۔

دونوں کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ ایسے مواقع پر ویسے بھی ایک دوسرے سے کہنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔

وہ جس خاموشی سے آیا تھا' اسی خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا' یہ نشانی تھی اس بات کی کہ وہ اب ان کے ساتھ رابطہ رکھنے کا خواہش مند ہے' اور جو اس کے ساتھ رابطہ رکھنے کی خواہش مند تھی' وہ اپنی خواہشوں کے ساتھ منوں مٹی تلے جا سوئی۔

حسین رضا اب بہت کم آفس جاتے' ان کی بزنس ڈیلنگز مینجرز کرتے' فائلیں دستخط کے لیے گھر لے آتے۔

ان کا معمول تھا' روزانہ کچھ وقت حیا کے کمرے میں گزارتے۔

سکینہ سے روز اپنی نگرانی میں صفائی کرواتے۔ بیٹی کے لکھے ہوئے لفظ پڑھتے' روتے اور اللہ سے اس کی مغفرت کے لیے دعائیں کرتے۔

حیا نے ایک جگہ ڈائری میں لکھا تھا۔
"میں ایک مٹی کے بت کی پوجا کرتی رہی اور خالی ہاتھ رہی۔ واقعی بت کسی کو کچھ نہیں دیتے۔ جیسے ابو جہل اور ابو لہب مقہور بھٹرے۔
محبوب تو مجھ سے روٹھ گیا ہے۔ میں اس کو منا نہیں پائی مگر میں نہیں چاہتی۔ اللہ مجھ سے روٹھ جائے۔
وہ لفظ لفظ پڑھتے، روتے۔
کاش میری بیٹی صنم سے صمد تک آجاتی تو اسے اپنی ریاضتوں کا صلہ بارگاہ الٰہی سے لبیک کی صورت ملتا۔
ہائے انسان! ہائے انسان... ! فنا کا مارا ہوا۔
فنا کی طرف دوڑنے والا۔ وہ روتے رہتے۔
"یا اللہ تو میری بیٹی پر رحم کر... اس کی روح کو شاد رکھ۔ اسے اپنی رحمت سے نواز۔"
وہ حمیرا کی تیمارداری اور دل جوئی کے بعد اپنا زیادہ تر وقت حیا فاؤنڈیشن کے کاموں کی نگرانی میں گزارتے۔ مختلف فلاحی کام کرتے۔
لوگ کہتے، کتنے رحم دل ہیں۔ فرشتہ ہیں فرشتہ۔
وہ سن کر شرمندہ ہو جاتے۔ اندر ہی اندر احساس ندامت مارتا۔ وہ تو بھٹکے ہوئے انسان تھے۔ بھٹک کر سیدھی راہ پر آئے تھے۔ مگر ماضی کے گناہ کا داغ سینے پر پیوست تھا۔
"یا اللہ مجھے معاف کر دے۔ یہ لوگ نہیں جانتے میرا گناہ، پر تو تو ہر گناہ کو جانتا ہے۔ میرے گناہوں سے درگزر فرما۔"

☼ ☼ ☼

وہ اکثر بے قراری سے سمندر کے کنارے آتا، بے چینی اسے کھینچ کے لے آتی۔
ماہم کی محبت بے لوث ہوتی تو شاید اسے واپس لے آتی مگر اس کے پیچھے تو دولت حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ بیٹی پر نظر پڑتی تو اپنے گناہ یاد آجاتے ماہم کی طرف بڑھتا تو حیا کا سراپا اس کے سامنے آجاتا۔ یہ ماہم ہی تھی جس نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اس کی آنکھوں پر اپنے حسن کی پٹی باندھ دی تھی۔
اس نے اس دن کے بعد ان کو کسی اور بات کا طعنہ نہیں دیا تھا۔ لیکن ان سے بہت دور ہو گیا تھا بلکہ خود سے بھی دور ہو گیا۔
وہ اپنی ذات میں بہت تنہا ہو گیا تھا۔ حیا کی باتیں، یادیں پل پل اس کے ساتھ تھیں۔
میں کہیں سے گزروں، وہ مجھے یاد آتی ہے۔
میں کہیں رکوں، وہ مجھے یاد آتی ہے۔
اک لفظ سے اللہ نے کائنات بنائی۔
محبت بھی اک لفظ ہی ہے۔
جس کا نزول کسی بھی قلب پر کائنات باطن سجا دیتا ہے۔
خوشیوں کے گل بوٹے، غم کے بنجر بیاباں ہجر کے صحرا، وصل کے دریا بہا دیتی ہے۔
وہ اس کے سامنے آجاتی ہنستی کھلکھلاتی۔
"زندگی میں جو لوگ ایک بار ٹوٹ کر محبت کر لیں، پھر ان کو دوسری محبت کی ضرورت نہیں رہتی۔"
ہنی مون کا خوش گوار لمحہ اس کے تصور کی اسکرین پر آموجود ہوا، منتظر حسنین کی اب سمجھ میں آیا کہ اس نے محبت کی ہی نہیں تھی ورنہ محبت اس طرح ٹھکرائے جانے والی چیز تو نہیں تھی۔
یہ مجھے چین کیوں نہیں آتا
ایک ہی شخص تھا، جہاں میں کیا
اس کی جدائی کے بعد اس کے بالوں کا رنگ سرمئی ہو گیا۔ اور کنپٹیوں پر سفیدی اگ آئی تھی۔
عمر کی فصل پک چکی اور محبت کے کھیت اجڑ چکے تو وہ عقل کے میدانوں کا شناور بنا، عقل اسے زماں و مکاں کے بیچ لٹکائے رکھتی۔
وہ کبھی محبت کے زمانے میں سانس لیتا۔
کبھی اپنے لٹے پٹے مکان میں فرستادہ ملتا۔
وہ جو منتظر حسنین تھا۔ منتظر ہی رہ گیا۔
اس کی گھنی گلابی، پلکوں تلے اداسیوں کے ڈیرے جم گئے۔
"ایک دن آئے گا، جب تم میری محبت سے ہار جاؤ گے۔"
یاد نے آنکھیں بھگو دیں۔
"وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔" اس نے نفرت سے ہنکارا بھرا تھا۔
اس کے کہے لفظ اس کا منہ چڑا رہے تھے، وہ دن آگئے تھے۔ وہ پورے کا پورا خود کو ہار بیٹھا تھا۔
وہ ہر وقت صرف اس کی محبت کے زمانے میں سانس لے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

بظاہر زندگی جاری ہے۔
مگر میری زندگی تو اس کے ساتھ جا سوئی ہے۔
میں اس کے بعد ہنسا۔ مگر دل سے نہیں۔ کھایا پیا، بچوں بیوی کے ساتھ آؤٹنگ، میل ملاپ، بزنس سرکل میں اٹھا بیٹھا۔
سب ہو رہا ہے، مگر صرف دنیا کو یقین دلانے کو کہ میں زندہ ہوں۔ میری موت سے صرف میں ہی واقف ہوں۔ میرے اندر بسا اک اندھیرا جہاں ہے۔ جس میں اندھوں کی طرح بھٹکنا میرا مقدر۔
محبت سے منہ موڑنے اور کسی بے قصور کو قصور وار قرار دے کر سزا دینے کی سزا بھگت رہا ہوں۔
اندھیرے غاروں میں بھٹکتا پھرتا ہوں۔
تجھے یاد تو دلائیں
تجھے یاد بھی تو آئیں
کبھی عہد جو کیے تھے
ہمیں قول جو دیے تھے
کبھی کانپتے لبوں سے
کبھی اشک کی زباں میں
کبھی کنج گلستاں میں
کسی کوئے رہ رواں میں
کسی دوست کے مکان میں
تو کہاں چلی گئی تھی
سمندر کی موجیں ابھر کر ساحل کی طرف آتیں، پھر واپس تنہا پلٹ کر چلی جاتیں۔
منچلے موجوں سے چھیڑ خانی کرتے پھر خالی ہاتھ لوٹا دیتے۔
تو کہاں چلی گئی تھی۔
تیرا بے قرار انشا
تیری جستجو میں حیراں
تیری یاد میں سلگتا
کبھی بستیوں، بنوں میں
کبھی سوئے کوہ صحرا
کبھی شور شمع رکوایا
کبھی بے کس و تنہا
لیے دید کی تمنا
بنا آرزو سراپا
تجھے ہر جگہ پکارا
تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ ہارا
تو کہ روح زندگی تھی
تو کہاں چلی گئی تھی
انشا جی کی نظم اسے رلاتی رہی۔ اس نے تھکے ماندے مسافر کی طرح واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے پتا نہیں۔ وہ بھی صنم سے صمد تک سفر کر پائے گا یا نہیں۔

☼